Regd. L. NO.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1972

اس پرچہ میں

(۱) — کنونشن کی روئیداد

(۲) — پرویز صاحب کا عبرت انگیز خطاب

پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

بدل اشتراک
پاکستان سالانہ دس روپے
غیر ممالک سالانہ ایک پونڈ

جلد (۲۵) | جون ۱۹۷۲ء | نمبر (۶)

فہرست

۱۔ لمعات ———— ۲

۲۔ عبوری آئینِ پاکستان ———— ۱۰

۳۔ حقائق و عبر ——— (مفتی محمود صاحب ۔ مینارِ بابل ۔ شیر آیا شیر آیا) ———— ۱۹
(طالب علم یا فریقِ مقدمہ ۔ مسلمانوں کی تباہی کا بنیادی سبب ۔ عربِ علن پاکستانی)

۴۔ پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ ——— (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۲ء میں محترم پرویز صاحب کا خطاب) ۲۵

۵۔ روئداد طلوعِ اسلام کنونشن ——— (محترم غلام صابر صاحب) ———— ۴۱

۶۔ کام آخر جذبہ بے اختیار آ ہی گیا ——— (سلیم پرویز صاحبہ) ———— ۵۲

۷۔ دارو کوئی سوچ ان کی پریشان نظری کا ——— (محترم خالد اسلام صاحب) ———— ۵۷

۸۔ رابطہ باہمی (اجتماع لائل پور) ———— ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ اشرف پریس ۔ ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جب سے ملک میں "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح رائج ہوئی، طلوع اسلام نے یہ تقاضا شروع کیا کہ یہ اصطلاح نہ صرف مبہم ہے بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے خطرناک بھی ہے۔ "سوشلزم" عبارت ہے مارکسزم کے فلسفۂ حیات پر متفرع معاشی نظام سے، اور مارکسزم کا فلسفۂ حیات، اسلام کے نظریۂ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ اس لئے کوئی مسلمان، سوشلزم کا قائل ہو نہیں سکتا اور جب سوشلزم اس طرح اسلام کی حریف ہے تو اس کے ساتھ "اسلامی" کا پیوند مجموعۂ اضداد ہے۔ ایک شخص، یا سوشلزم کا قائل ہو سکتا ہے یا اسلام کا۔ سوشلزم کا اقتصادی نظام بے شک قرآن کریم کے معاشی نظام کے ایک حد تک مماثل ہے، لیکن سوشلزم کے مدعی اس کے معاشی نظام کو مارکسزم کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک، مارکسزم کی بنیادوں کے بغیر سوشلزم کی اقتصادی عمارت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ بنابریں "اسلامی سوشلزم" کے مدعیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مسلک کی وضاحت کریں۔ اگر وہ سوشلزم کے معترف ہیں تو انہیں "اسلامی" نہیں کہنا چاہیئے۔ اور اگر وہ "اسلامی" کے قائل ہیں تو انہیں "سوشلزم" کو چھوڑنا چاہیئے۔ ہمارا یہ تقاضا گزشتہ چار سال سے مسلسل جاری تھا۔ طلوع اسلام کی گزشتہ کنونشن میں پرویز صاحب نے اس موضوع کو اپنے خصوصی خطاب کا عنوان قرار دیا اور اس مسئلہ پر ایسی سیر حاصل بحث کی کہ ارباب فکر و نظر کی رائے میں ہمارے ہاں اس قسم کی کوشش اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ ان کے اس خطاب کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا (اس کا نام ہی "اسلامی سوشلزم" ہے) اور اس نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ اس کا مطالبہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے اس خطاب کے آخر میں پرویز صاحب نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ صدر بھٹو کو مخاطب کر کے کہا تھا:

> اس وقت آپ کو فطرت نے ایسا اقتدار عطا کیا ہے کہ آپ جس قسم کا چاہیں نظام نافذ کر سکتے ہیں تو پھر آپ کو کیا امر مانع ہو سکتا ہے کہ آپ اس ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج کر دیں۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ملت پاکستانیہ آپ کے قدم چوم لے گی۔ عالم اسلام میں آپ کو قیادت عظمیٰ حاصل ہو جائے گی۔ اقوام عالم آپ کی طرف رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی، اور جریدۂ عالم پر آپ کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ سعادت آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اٹھئے اور اسے لبیک کہئے۔ لیکن اگر آپ نے اس موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا تو زمانہ آپ کی اس حرماں نصیبی اور قوم کی سوختہ بختی پر خون کے آنسو روئیگا۔ خدا کے لئے ایسا نہ ہونے دیجئے۔

اسے حسن اتفاق کہئے یا اس احساس کا غیر شعوری تقاضا کہ انہی دنوں جرمن سے شائع ہونے والے میگزین (DER SPIEGEL) کے ایک نامہ نگار نے صدر مملکت (مسٹر بھٹو) کے ساتھ اپنے انٹرویو میں یہ متعین سوال پوچھ لیا کہ جس قسم کی سوشلزم کے وہ مدعی ہیں اس کا مفہوم کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں جو کچھ صدر بھٹو نے کہا اس سے مترشح ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے

کے ان نالوں کا جواب افلاک سے آہستہ آہستہ آنا شروع ہو گیا ہے۔ صدر بھٹو نے فرمایا۔

ہماری پارٹی کا سوشلزم مسلمانوں کا سوشلزم ہے۔ ہمارا اپنا مخصوص مذہب (FAITH) ہے۔ اپنی اقدار ہیں' اپنی روایات ہیں۔ ہم ان کے پابند ہیں۔ جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے' ہم مارکسزم کے صرف اس حصے کو قبول کرتے ہیں جس کا تعلق معاشیات سے ہے۔ ہم پورے کے پورے مارکسزم کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم اس کے ولف سے یکسر قائل نہیں۔ ہم اس کے فلسفہ جدلیت کو صحیح نہیں مانتے۔ نہ ہی اس کے اس نظریہ کو مانتے ہیں کہ معاشرہ میں نہ طبقات رہیں' نہ ریاست۔ ایک مارکسسٹ اسٹیٹ پچاس سال سے قائم ہے لیکن وہ ابھی تک (STATE-LESS) نہیں بن سکی۔ نہ ہی وہاں طبقات کا وجود ختم ہوا ہے۔ نہ ہی ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ کائنات کی بنیاد سراسر مادی ہے۔ نہ خدا کا وجود ہے نہ روحانی اقدار کا۔ ہم اس فلسفہ کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس کے صرف اس حصہ کو تسلیم کیا ہے جس کا تعلق سائنٹیفک معاشیات سے ہے اور مرورِ زمانہ سے مارکسزم کا یہ حصہ بھی ایک حد تک متروک ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں (مارکسزم کے معتقدین کی طرح) جامد اور متصلب (RIGID) ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی ہم جامد ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ مارکسزم نے اقتصادیات کا گہرا تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔ اس میں کا جو حصہ' ہماری بصیرت کے مطابق صحیح اور ہمارے ملک کے لئے مفید ہو گا اسے ہمیں' زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قبول کر لینا چاہیئے' اور اسے محض ایک پیمانے کے طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔

(پاکستان ٹائمز ۱۴ مئی)

اگرچہ ہم چاہتے تھے کہ یہ جواب اس سے بھی زیادہ واضح ہوتا اور سوال کرنیوالے کو بتایا جاتا کہ ہم قرآن کریم کے اس معاشی نظام کے قائل ہیں جو مارکسزم کے اقتصادی نظام سے بھی کہیں آگے لے جاتا ہے اور اس کی عمارت اس فلسفہ زندگی کی محکم بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جو کبھی ناکام یا ناممکن العمل ثابت نہیں ہو سکتا۔ لیکن بایں ہمہ' مسٹر بھٹو نے جس حد تک اپنے مسلک کی وضاحت کر دی ہے وہ بھی غنیمت میں سے ہے' اور اس کے لئے ہم انہیں در خور تبریک سمجھتے ہیں۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور ملک کا وہ طبقہ جو کہا کرتا تھا کہ مسٹر بھٹو یہاں دہریت اور مادیت پر مبنی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں' ان کی زبانیں بند ہو جائینگی۔ اس سے ایک اور فائدہ بھی ہو گا۔ خود پیپلز پارٹی کے اندر ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو خالصۃً اور کلیۃً مارکسزم کا قائل ہے۔ مسٹر بھٹو کی اس وضاحت کے بعد انہیں اپنے مسلک پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ انہیں یا تو اپنا نظریہ تبدیل کرنا ہو گا اور یا پارٹی کا ساتھ چھوڑنا پڑیگا۔ بشرطیکہ وہ بنا بر مصلحت' منافقانہ طور پر اس کے ساتھ چپکے نہ رہنا چاہیں۔ ہم پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو سے درخواست کرینگے کہ وہ اس وضاحت کو اس سے بھی زیادہ متعین الفاظ میں اپنی پارٹی کے منشور میں شامل کر لیں تاکہ اسے جماعتی سند بھی حاصل ہو جائے۔

صدر بھٹو کی اس وضاحت پر' پیپلز پارٹی کے وابستگان میں سے صرف ایک کا ردِ عمل اس وقت تک ہمارے سامنے آیا ہے۔ اور وہ ہے اس پارٹی کے ترجمان' روزنامہ مساوات کا تبصرہ جو اس کی ۱۵ مئی کی اشاعت کے اداریہ میں (ضمناً) لکھا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے :-

مغربی دنیا صدر بھٹو کی سوشلسٹ حیثیت کے بارے میں چیں بجبیں ہے مگر افریشیائی اور لاطینی امریکی ملکوں کی ترقی کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ سوشلسٹ معیشت سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور یہ

نہیں ہو سکتا کہ مرغی انڈا تو دے مگر اس میں سے چوزہ نہ نکلے۔ سوشلسٹ معیشت کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں اور صدر بھٹو اس حد تک مارکسی انقلاب اور طرزِ فکر کے حامی ہیں۔ مگر وہ ایک مسلمان قوم کے فرزند ہیں جس کو اپنی روایات اور تہذیبی اقدار عزیز ہیں۔ جہاں مارکسی طرزِ فکر تہذیبی روایات اور اقدار کی نفی کرے گا، وہاں صدر بھٹو کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

ہم اس تبصرہ کا نوٹس نہ لیتے کیونکہ اگر یہ دیانتداری سے لکھا گیا ہے تو مبنی بر جہالت ہے، اور اگر اس سے مقصد کتمانِ حقیقت یا التباس آفرینی ہے تو یہ بددیانتی ہے لیکن چونکہ یہ شائع ہوا ہے اس روزنامہ میں جو مسٹر بھٹو کی پارٹی کا آفیشیل ہے اور بنا بریں عام تاثر یہی ہے کہ اس میں مسٹر بھٹو کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس ضمن میں الجھاؤ پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اسے بے نقاب کر دیا جائے۔ کہا یہ گیا ہے کہ

سوشلسٹ معیشت سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوتی ہے ..... اسے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں!
اور صدر بھٹو اس حد تک مارکسی نظام اور طرزِ فکر کے حامی ہیں۔

یہ قطعاً غلط ہے اور صدر بھٹو سے ایسی بات منسوب کی جا رہی ہے جس سے بری الذمہ ہونے کے لئے انہوں نے اپنے تصورِ سوشلزم کی وضاحت ضروری سمجھی ہے۔ یہ دعوٰے کہ "سوشلسٹ معیشت سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اسے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں" مارکسزم کا فلسفہ جدلیت ہے، اور صدر بھٹو اپنے بیان میں واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ وہ جدلیت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) صدر بھٹو کا اس وضاحت سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ کھلے الفاظ میں بتا دیں کہ وہ فلسفہ جدلیت کو (جو مارکسزم کی بنیاد ہے) مردود قرار دیتے ہیں۔ بھٹو بیچارہ تو یہ کہہ رہا ہے اور یہ اسکے ترجمان ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ (مسٹر بھٹو) اس حد تک مارکسی انقلاب اور طرزِ فکر کے حامی ہیں۔ صدر بھٹو نے کہا ہے کہ وہ مارکسی طرزِ فکر کے قطعاً حامی نہیں۔ وہ صرف اس کے اقتصادی نظام سے استفادہ چاہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ مسٹر بھٹو کے یہ نادان دوست (یا دانا دشمن) ان کی پوزیشن کو کس طرح خراب کرتے ہیں!

ضمناً اداریہ میں جو مثال دی گئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ صاحب فلسفہ جدلیت سے بھی صحیح طور پر واقف نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ:-

سوشلسٹ معیشت سرمایہ دارانہ بطن سے پیدا ہوتی ہے؛ یہ نہیں ہو سکتا کہ مرغی انڈا تو دے مگر اس میں سے چوزہ نہ نکلے۔

مارکسزم کا فلسفہ جدلیت یہ ہے کہ ایک نظام کے بطن سے جو نظام پیدا ہوتا ہے وہ اس (پہلے) نظام کی ضد ہوتا ہے۔ جیسے سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے سوشلزم کا معاشی نظام پیدا ہوتا ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اداریہ نگار نے اپنے دعوٰی کے اثبات کے لئے جو مثال بطور دلیل پیش کی ہے وہ اس دعوٰی کی نفی کرتی ہے۔ مرغی کے انڈے سے مرغی کی ضد (یعنی بلی) پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے اُسی جیسی مرغی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مثال نظریہ جدلیت کی تکذیب کرتی ہے نہ کہ تائید۔

اس کے بعد اداریہ نگار نے جو چند الفاظ لکھے ہیں ان سے اسلام کے خلاف اسکے تحت الشعور میں چھپا ہوا بغض بیساختہ ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ صدر بھٹو نے کہا تھا کہ ہم مسلمان کی حیثیت سے مارکسزم کے فلسفہ کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں جو نہ خدا کو مانتا ہے نہ روحانی اقدار (SPIRITUAL VALUES) کو۔ ایک مارکسسٹ کے نزدیک "روحانی اقدار" کا تصور تک کفر ہے۔ اس

لئے وہ صرف تہذیبی یا ثقافتی اقدار کہے گا۔ روحانی اقدار کبھی نہیں کہے گا۔ اداریہ نگار جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ "روحانی اقدار" نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ:-

مگر وہ (صدر بھٹو) ایک مسلمان قوم کے فرزند ہیں جس کو اپنی روایات اور تہذیبی اقدار عزیز ہیں۔ جہاں مارکسی طرزِ فکر تہذیبی روایات اور اقدار کی نفی کریگا وہاں صدر بھٹو کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

مارکسی فکر، تہذیبی یا ثقافتی روایات و اقدار کی نفی کبھی نہیں کرتا۔ وہ تو، بلکہ، انکی گرہیں اور مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اسلام کی روحانی اقدار کی جگہ لے لیں فیض احمد فیض اور ان کے ہمنوا آجکل پاکستان میں اسی "جہاد" میں مصروف ہیں کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کی ثقافتی اقدار کو ابھارتے ہیں تاکہ ان کی بنیادوں پر یہاں مختلف قومیتوں کا وجود تسلیم کر لیا جائے۔ اور اس طرح روحانی اقدار کے اشتراک کی بنا پر تمام صوبوں کے مسلمانوں کا ایک قوم کے پیکر میں ڈھل جانے کا تصور مٹ جائے۔ مارکسزم یہی چاہتا اور کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مساوات بھی روحانی اقدار کی جگہ تہذیبی اقدار کو نمایاں کر رہا ہے حالانکہ صدر بھٹو نے روحانی اقدار کہا ہے۔ تہذیبی اقدار کا ذکر تک نہیں کیا۔ یاد رکھئے، اسلام کی کوئی تہذیبی یا ثقافتی اقدار نہیں صرف دینی اقدار ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ تہذیب یا ثقافت ان محسوس پیکروں کو کہتے ہیں جن میں یہ دینی (یا عام الفاظ میں روحانی) اقدار مرئی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یہ محسوس پیکر زمان اور مکان کے اختلاف سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کی اصل (یعنی مستقل اقدار خداوندی) ہمیشہ اور ہر جگہ ویسی ہی رہیں گی اس لئے اسلامی تہذیب یا اسلامی ثقافت جیسی اصطلاحات غلط اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب ہیں۔ بہر حال صدر بھٹو نے اپنے بیان میں "روحانی اقدار" کا ذکر کیا ہے جنہیں مدیر مساوات تہذیبی اقدار کہہ کر انہیں پھر حریم کعبہ سے بتکدۂ مارکسزم کی طرف لیجانے کی سعی مذموم کر رہا ہے۔ ہمارے عزیز! بھٹو اگر مسلمان رہنا چاہتا ہے تو اسے مسلمان رہنے دیجئے۔

——— (۱) ———

معاشیات کے متعلق صدر بھٹو نے اپنے مسلک کی جو وضاحت کی ہے اس پر ہم نے انہیں درخورِ تبریک و تہنیت قرار دیا ہے لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ "دو قومی نظریہ" کے متعلق ان کا ذہن ابھی تک صاف نہیں۔ انہوں نے، گزشتہ اپریل میں انڈین پبلک ٹیلی ویژن نیوز لندن کے نمائندہ مسٹر رچرڈ لنڈلے کو ایک مفصل انٹرویو دیا جس کی تفصیلات پاکستان ٹائمز بابت ۱۶ مئی میں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں دو قومی نظریہ کا بھی ذکر آگیا۔ اس سلسلہ میں صدر بھٹو نے کہا:-

انڈیا کہتا ہے کہ بنگلہ دیش کی علیحدگی سے دو قومی نظریہ مسمار ہو گیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ تین قوموں کے وجود میں آجانے سے دو قومی نظریہ کس طرح مسمار ہو گیا۔ دو قومی نظریہ اس صورت میں مسمار ہوتا جب ایک قوم وجود میں آتی۔ (بات یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے) انڈیا کا دعویٰ تھا کہ وہاں صرف ایک قوم بستی ہے تو ہم نے کہا کہ نہیں! وہاں ایک نہیں دو قومیں ہیں۔ اگر ہم اس وقت کہتے کہ وہاں تین قومیں بستی ہیں تو انڈیا کہتا کہ "ارے رام! یہ بات بالکل خارج از بحث ہے ہم صرف دو قومیں تسلیم کریں گے ہم تین قومیں تسلیم نہیں کر سکتے۔ لہٰذا (اب) ایک تیسری قوم کے وجود میں آجانے سے دو قومی نظریہ کا ابطال نہیں ہو سکتا۔ اس کا ابطال اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ (یعنی بنگلہ دیش اور انڈیا مل کر) ایک قوم بن جاتے۔ اگر انڈیا اس وقت دو قومی نظریہ کو اس لئے ناکام ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس طرح مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو پھر سے اپنے اندر جذب کر لے

تو بات اور ہے ورنہ حقیقت یہ نہیں۔

آپ دیکھئے کہ اس جواب میں کس قدر ذہنی انتشار (CONFUSION) ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ نہ تو جواب دینے والے کے ذہن میں دو قومی نظریہ کا صحیح تصور ہے اور نہ ہی وہ بنیاد جس پر اس نظریہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کا ذہن پس منظر دیتا نہیں اور نہ ہی انہیں دو قومی نظریہ (اور نظریۂ پاکستان) کا قرآن کی روشنی میں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ:-

(۱) قومیت کی تشکیل کا معیار، نسل، رنگ، خون، وطن یا مملکت کا اشتراک نہیں بلکہ آئیڈیالوجی (ایمان) کا اشتراک ہے۔

(۲) یہ آئیڈیالوجی خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

(۳) جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کرتے ہیں وہ ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں کیوں نہ بستے ہوں۔ انہیں مومن (یا امتِ مسلمہ یا امت محمدیہ) کہا جاتا ہے۔ جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہیں کرتے وہ دوسری قوم کے افراد ہیں۔ انہیں غیر مسلم (یا کافر) کہا جاتا ہے۔

لہٰذا قومیں دنیا میں دو ہی ہیں — مومن اور کافر — نہ یہ دونوں مل کر ایک قوم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی دنیا میں دو سے زیادہ قومیں ہو سکتی ہیں۔

(۴) اگر وطن (یا مملکت) کے اشتراک کو قومیت کا معیار قرار دیا جائے (یعنی ایک مملکت میں بسنے والے تمام لوگوں کو بلا لحاظ مذہب وغیرہ) ایک قوم قرار دیا جائے تو دنیا میں جتنی مملکتیں ہوں گی اتنی ہی قومیں ہوں گی۔ اسی (غیر اسلامی) معیار کے مطابق تقسیم سے پہلے ہندوستان میں ایک قوم بستی تھی تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی دو مملکتیں وجود میں آگئیں اس لئے وہ ایک قوم دو قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ بنگلہ دیش کو اگر جداگانہ مملکت تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ ہندوستان نے کر لیا ہے) تو پھر ایک تیسری قوم بھی وجود میں آجائے گی۔ یہ انڈیا کا موقف ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ صدر بھٹو بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں چنانچہ انہوں نے امریکن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ:-

ہم (اہل پاکستان اور اہل ہند) ۱۹۴۷ء تک ایک ہی قوم تھے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۵ مئی)

یہ غلط ہے۔ ہم ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی ایک قوم نہیں تھے۔ ہمارے اور ہندوؤں کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔ ہم کہتے تھے کہ اسلام میں قومیت کا معیار وطن یا مملکت کا اشتراک نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے۔ اس لئے ہم اور تم ایک قوم نہیں۔ اس حقیقت کو قائداعظمؒ نے دو لفظوں میں جس جامعیت سے بیان کیا ہے اس پر غور کرنے سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ پاکستان کب وجود میں آئے گا۔ انہوں نے کہا کہ تم پوچھتے ہو کہ پاکستان کب وجود میں آئے گا؟

پاکستان تو اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا (کیونکہ اس سے یہاں دو قومیں وجود میں آگئی تھیں)

صدر بھٹو نے پچھلے دنوں بیرونی ممالک کے بہت سے نمائندوں کو انٹرویو دیئے ہیں، اور ان میں کا ایک ایک انٹرویو اخبارات کے کئی ایک صفحات پر پھیلا ہوا ہوتا ہے لیکن یہ دیکھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے انتخاب میں ایک پختہ کار سیاستدان کی سی احتیاط نہیں برتتے جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال اور اندیشہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انہی

الفاظ کو لیجیے کہ ـــــ "۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں ہم ایک ہی قوم تھے"۔

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اگر وہاں ایک ہی قوم بستی تھی تو پھر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کیا تھی؟ اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس دعویٰ پر تھی کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی' بلکہ مسلمان' اپنے دین کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اور چونکہ یہ ایک الگ قوم ہیں اس لئے انہیں ایک الگ مملکت درکار ہے جہاں یہ اپنے اس دین کے مطابق جس کی رو سے یہ ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں' زندگی بسر کر سکیں۔ صدر بھٹو کا یہ بیان (کہ ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں ایک قوم بستی تھی) دعوائے پاکستان کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے' اور پاکستان کے ایک الگ مملکت ہونے کی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ حیرت ہے کہ صدر بھٹو تو یہ کہہ رہے ہیں' اور وہاں کے ہندو کو آج بھی یاد ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران مابہ النزاع مسئلہ کیا تھا۔ حال ہی میں ہندوستان کے اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جسے غور سے سنیئے۔

> نئی دہلی ۱۰ اپریل۔ ہندوستان باور کرتا ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام نے دو قوموں والے نظریہ کے بھوت کو ہمیشہ کے لئے پھوڑ دیا ہے۔ یہی دو قوموں والا نظریہ تھا جو باعث بنا تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ ملکوں کے قیام کا۔ ہندوستان کی وزارت خارجہ کی طرف سے کل ہی ایک رپورٹ بغرض اشاعت اخبارات کو بھیجی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں سرکاری طور پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ دو قوموں والا نظریہ یعنی (TWO NATION THEORY) ہی باعث تھی برصغیر کے امن و آشتی میں رخنہ اندازی کی' اور اب چونکہ یہ تھیوری مسمار ہو چکی ہے تو ہندوستان کی نظروں میں اب ہندوستان اور پاکستان کے مابین تعلقات کے معمول پر آنے اور صلح اور دوستی کے قائم ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے قائم ہونے سے یہ تصور ختم ہو گیا ہے کہ ریاستیں مذہب کی بنیاد پر بن سکتی ہیں۔ (رائٹر نیوز ایجنسی۔ بحوالہ چٹان ۱۵ مئی)

ہمیں امید ہے کہ صدر بھٹو اپنے مجوزہ مذاکرات میں اس قسم کی کوئی بات اندرا گاندھی کے ساتھ نہیں کریں گے' ورنہ وہ لمبے لے اڑیں گے اور ہم خود اپنی زبان سے پاکستان کی بنیاد مسمار کر بیٹھیں گے۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ جب "دو قومی نظریہ" کے متعلق صدر بھٹو کے ذہن میں اس قسم کا الجھاؤ ہے تو نظریۂ پاکستان کے متعلق بھی شاید ان کے ذہن میں اسی قسم کا التباس ہو۔ دو قومی نظریہ کا تعلق معیارِ قومیت سے ہے اور نظریۂ پاکستان کا تعلق تصورِ حکومت سے' اگرچہ یہ دونوں نظریئے ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔

آپ دنیا کا کوئی نظامِ حکومت بھی دیکھیے' اس میں بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ عہدِ قدیم میں یہ اطاعت راجہ یا بادشاہ کی ہوتی تھی۔ یورپ کے بعض مفکرین نے انسانوں کی اس محکومیت کو وجہ تذلیلِ انسانیت قرار دیا اور کہا کہ اطاعت' قانون کی ہونی چاہیئے نہ کہ اشخاص کی۔ نظری طور پر یہ تبدیلی بڑی خوش آئند تھی لیکن جب اس اصول پر عمل پیرا ہونے کا وقت آیا تو سوال پیدا ہوا کہ وہ قوانین کہاں سے لئے جائیں جن کی اطاعت انسانوں کی اطاعت نہ کہلائے۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد انہوں نے ڈیماکریسی کا نظام وضع کیا جس کے متعلق کہا گیا کہ اس میں اطاعت کسی دوسرے کی نہیں ہوتی بلکہ اطاعت ان قوانین کی ہوتی ہے جنہیں قوم خود اپنے لئے وضع کرتی ہے۔ لیکن تھوڑے سے عرصہ کے تجربے نے بتایا کہ ـــ یہ بھی فریب ہے رنگ و بوئے دعا شقی کے ـــ اس نظام میں بھی انسان دوسروں کی غلامی سے نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ نظامِ کہن میں اگر ایک انسان کے احکام کی اطاعت کرنی پڑتی تھی تو اس نظام میں انسانوں کے ایک گروہ

(برسر اقتدار پارٹی) کے فیصلوں کی اطاعت باقی قوم کو کرنی پڑتی ہے۔ اصل کے اعتبار سے اس نظام اور اس نظام میں کوئی فرق نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

قرآن کریم نے کہا کہ یہاں تک تو صحیح ہے کہ اطاعت کسی انسان کی نہیں بلکہ قانون کی کرنی چاہیئے۔ لیکن اس قانون کی جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو بلکہ خدا کا عطا فرمودہ ہو۔ یہ قانون خدا کی کتاب (قرآن کریم) میں ملے گا۔ لہٰذا قرآن کریم کے احکام و اصولات کی اطاعت صحیح آزادی ہے اور باقی ہر قسم کی آزادی غلامی کی غلامی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہندوؤں کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ تھا کہ انگریز وہاں سے چلا جائے اور اس کے بعد اہل ہند کو اس کی آزادی حاصل ہو کہ وہ اپنی حکومت آپ قائم کر سکیں۔ لیکن (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم نہیں تھا۔ ان کے نزدیک حکومت خواہ بدیشی انگریز کی ہو اور خواہ اپنے دیش کے انسانوں کی یہ ہر حال غلامی ہے حتیٰ کہ اگر حکومت خالصتہً مسلمانوں کی ہو خواہ وہ بادشاہت کی شکل میں ہو یا جمہوریت کے انداز کی اور اس میں حکومت کتاب اللہ کی نہ ہو تو وہ بھی غلامی ہے اور صرف غلامی ہی نہیں بلکہ کفر بھی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

لہٰذا ہندوستان میں ہمارا مطالبہ یہی نہیں تھا کہ چونکہ ہم بربنائے دین ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اس لئے ہم اپنی مملکت الگ قائم کریں گے۔ ہمارا مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہم اسلامی زندگی اسی صورت میں بسر کر سکتے ہیں جب ہم کتاب اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کریں۔ اور یہ بات اپنی آزاد مملکت کے بغیر ناممکن ہے اس لئے ہم جداگانہ مملکت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یہ ہے نظریۂ پاکستان ــــ ایک ایسی مملکت کا قیام جس میں ہم کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے نظریۂ پاکستان کی ان ہر دو شقوں سے انحراف برتا۔ پہلی شق یہ تھی کہ ایک وطن یا مملکت کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے۔ ہم نے یہاں آکر پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو ایک قوم قرار دے دیا۔ اس طرح اس نظریہ کی شق اول سے انحراف برتا۔ اور اس پچیس سال کے عرصہ میں ایک دن بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کی۔ اس طرح اس کی دوسری شق سے بھی سرکشی اختیار کی۔

اگر کسی نظریہ کی شکست کا ثبوت اس امر کو قرار دے دیا جائے کہ اس نظریہ کی مدعی قوم نے اس پر عمل نہیں کیا، تو بلاشبہ نظریۂ پاکستان آج سے نہیں تشکیلِ پاکستان کے یوم آغاز سے ایک شکست خوردہ نظریہ ہے۔ اس کے لئے اس دلیل کی بھی ضرورت نہیں کہ بنگلہ دیش مغربی پاکستان سے الگ ہو گیا ہے لیکن اگر کوئی نظریہ ابدی صداقت پر مبنی ہے تو اسے کبھی شکست خوردہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ مثلاً عدل کا نظریہ ابدی صداقت پر مبنی ہے۔ اگر دنیا میں کہیں بھی عدل نہ ہوتا ہو تو بھی یہ نظریہ جھوٹا ثابت نہیں ہو سکتا۔ (یا مثلاً ذرا نچلی سطح پر سمجھنے کے لئے) یہ قانون کہ زندگی کا مدار پانی پر ہے ایک ابدی صداقت ہے۔ یہ قانون اس وقت بھی سچا تھا جب خطۂ ارض پر ہنوز زندگی کی نمود نہیں ہوئی تھی اور اس وقت بھی سچا ہی ہو گا جب یہاں زندگی باقی نہ رہے۔ نظریۂ پاکستان یہ ہے کہ:۔

(۱) قومیت کا معیار فکر و نظر کی ہم آہنگی ہے۔ اور

(۲) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔

یہ نظریہ ابدی صداقت ہے جو اس کا محتاج نہیں کہ انسان اس پر عمل کریں تو یہ سچا قرار پائے اور اگر وہ اس پر عمل نہ کریں تو یہ جھوٹا ثابت ہو جائے۔ عمل کرنا تو ایک طرف، اگر دنیا میں کوئی شخص بھی اس نظریہ کی صداقت کا قائل نہ ہو، یہ اس وقت بھی جھوٹا اور غلط قرار نہیں پا جائے گا۔ ابدی صداقتوں یا مستقل اقدار کی پوزیشن ہی یہ ہوتی ہے جس طرح مثلاً خدا کا وجود ایک ابدی صداقت ہے۔ اگر بفرضِ محال دنیا کے تمام انسان خدا کے وجود کے منکر ہو جائیں تو وہ پھر بھی صداقت ہی رہیگا۔ ہمارے نزدیک نظریۂ پاکستان ایک ابدی صداقت ہے کیونکہ یہ قرآن کے اصولوں پر مبنی ہے اس لئے یہ کبھی باطل قرار نہیں پا سکتا خواہ بنگلہ دیش ہمارے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ حتیٰ کہ اگر (خاکم بدہن) کل کو مغربی پاکستان الگ مملکت کی حیثیت سے باقی نہ رہے تو بھی اس نظریہ کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہ ہمارا ایمان ہے اور اگر کوئی اسے دلائل و براہین کی رو سے سمجھنا چاہے تو ہم اسے ایسا سمجھا بھی سکتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ مذاکرات سے پہلے صدر بھٹو کا ذہن ان بنیادی حقائق کے متعلق صاف اور روشن ہو جائے کہ پاکستان کے ایک جداگانہ مملکت بننے اور رہنے کے وجوہ جواز یہی ہیں، ورنہ عام مروجہ سیاسی منہاج کے مطابق دیکھئے تو ایک ملک (ہندوستان) میں رہنے والی ایک قوم (یعنی وطنیت یا مملکت کے اشتراک کو معیار قومیت تسلیم کرلینے کے فطری نتیجے کے طور پر، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک قوم) کے ایک حصہ (یعنی مسلمانوں) کا یہ مطالبہ کہ ہم اپنی الگ مملکت چاہتے ہیں کسی صورت میں قابلِ پذیرائی قرار نہیں پا سکتا تھا۔ یہ مطالبہ صرف دین کی بنیادوں پر جائز قرار پا سکتا تھا اور قرار پایا، اور صرف دین کی بنیادوں پر اسے قائم رکھا جا سکتا ہے لیکن یہی حقیقت اس وقت کچھ ایسی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہے کہ اس باب میں کسی کا ذہن صاف نظر نہیں آتا۔ ہمیں تو کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اگر یہ خطہ زمین محفوظ رہا (خدا اسے ابدالآباد تک محفوظ رکھے) تو طلوع اسلام کو نظریۂ پاکستان کے محاذ پر اسی جنگ کا از سرِ نو آغاز کرنا پڑے گا جو اس نے تقسیم سے پہلے لڑی تھی — اور شاید یہ جنگ اس جنگ سے بھی زیادہ شدید ہو۔ وہاں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا جاتا تھا، اور یہاں اب خود مسلمانوں کے اندر چار چار قومیتوں کا نظریہ ابھارا جا رہا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　　　که افتاد است از بامِ بلندے

تحریکِ طلوعِ اسلام کی مختلف بزموں نے (۱) آئین ساز کمیٹی سے درخواست کی ہے کہ وہ مستقل آئین کو ان قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب کریں جو ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ میں واضح کئے گئے ہیں۔ اور (۲) صدر بھٹو کو پیغامِ تہنیت بھیجا ہے کہ انہوں نے مارکسزم کو مردود قرار دے کر معاشی نظام کے متعلق اپنے مسلک کی وضاحت کر دی ہے۔ خدا انہیں توفیق عطا فرمائے کہ وہ ملک میں قرآنی نظامِ معیشت رائج کر دیں۔

عبوری آئینِ پاکستان

اس بدنصیب ملک کی آئینی داستان اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ

تزا مشیدیم ، پرستیدیم ، شکستم

نو سال کے صبر آزما انتظار کے بعد ۱۹۵۶ء میں اس کا پہلا آئین مرتب ہوا تو اسے دو سال کے بعد (اکتوبر ۱۹۵۸ء میں) (سابق صدر) ایوب خان نے کالعدم قرار دے دیا۔ چار سال کے بعد (۱۹۶۲ء) میں ایوب خان کا آئین عمل میں آیا تو اسے ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان نے منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد اب مسٹر بھٹو نے اپنا عبوری آئین مرتب کیا ہے۔ اسے وسط اپریل میں رسمی طور پر نیشنل اسمبلی کے دو روزہ اجلاس میں پیش کر کے منظور کرا لیا گیا۔ اس کی بنیادوں پر اب مستقل آئین مرتب کیا جائے گا۔

مسٹر بھٹو "اسلامی سوشلزم" کے مدعی ہیں۔ چونکہ ہم ابھی تک اس اصطلاح کا مفہوم نہیں سمجھ سکے، اس لئے ہمارا خیال تھا کہ اگر اس آئین میں اسلام نہیں تو کم از کم سوشلزم تو ضرور ہو گی۔ لیکن اس میں ہمیں نہ اسلام نظر آیا نہ سوشلزم۔ یہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے آئینوں کا ملغوبہ سا ہے جس کی بنیاد صدارتی نظام اور پریذیڈریل سسٹم اوف گورنمنٹ پر رکھی گئی ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس آئین میں بھی سابقہ آئینوں کی طرح اس بنیاد کو ختم کر دیا گیا ہے جس کی رُو سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا۔ مطالبہ اور تشکیلِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا۔ دو قومی نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم نہیں قرار پا سکتے۔ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں اور کوئی غیر مسلم اس قوم کا رکن قرار نہیں پا سکتا۔ زیرِ نظر آئین میں ۔۔۔ بجز اس کے کہ صدر اور نائب صدر کے عہدہ کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی ہے ۔۔۔ کسی جہت سے بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو مسلمانوں سے الگ قرار نہیں دیا گیا۔ ان دونوں کو وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کے بعد پاکستان کی الگ مملکت کی وجہ جواز کیا رہ جاتی ہے؟ اگر پاکستان میں بسنے والے مسلمان اور ہندو ایک قوم کے افراد ہیں تو پاکستان کے مسلمان اور بھارت کے ہندو ایک قوم کیوں نہیں تسلیم کئے جا سکتے اور جب یہ ایک قوم تصور کئے جا سکتے ہیں تو پھر پاکستانی مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی (JUSTIFICATION) کیا رہ جاتی ہے۔؟

پاکستانی مسلمانوں اور غیر مسلموں کو الگ الگ قرار دینا تو درکنار، اس آئین میں بھی انتخاب جداگانہ نہیں رکھا گیا مخلوط رکھا گیا ہے۔ وہی مخلوط انتخاب جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔

باقی رہا نظریۂ پاکستان سو اس کا آئین میں کہیں ذکر نہیں حلفِ وفاداری میں البتہ یہ الفاظ موجود ہیں کہ :-

میں اسلامک آئیڈیالوجی کے تحفظ کی کوشش کرونگا جو تخلیقِ پاکستان کی بنیاد ہے۔

لیکن آئین میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ "اسلامک آئیڈیالوجی" ہے کیا؟ جس کے تحفظ کا حلف لیا گیا ہے۔ پچیس سال سے اس ملک میں یہ مذاق ہو رہا ہے کہ "اسلامک آئیڈیالوجی" اور "آئیڈیالوجی آف پاکستان" کے الفاظ وِرد و وظیفہ کی طرح دہرائے جا رہے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ ان الفاظ کا بالآخر مفہوم کیا ہے؟ اور یہی ان کے نزدیک سب سے بحث کی صورت ہے۔ اگر ان الفاظ کا مفہوم متعین کر دیا جائے تو پھر یہ دیکھا اور پرکھا جا سکے گا کہ جس بات کا حلف لیا گیا تھا وہ پوری بھی ہو رہی ہے یا نہیں؟ اور اگر پوری نہیں ہو رہی تو پھر اس کا مواخذہ کیا جا سکے گا۔ "بات پوری ہو رہی ہے" کے پرکھنے کا طریقہ یہ ہو گا کہ اس نظریہ پر عمل کیا جا رہا ہے یا نہیں! یاد رکھیئے! کسی نظریہ کے تحفظ کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اس کا تعویذ لکھوا کر اسے چاندی یا سونے کے خول میں منڈھا لیا جائے اور اس طرح اسے موذی اثرات سے محفوظ کر لیا جائے۔ نظریہ اس اصول کا نام ہوتا ہے جس پر انسانی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اس کے تحفظ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر "نظریہ" اس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا کہ اَسْمَاءٌ سَمَّیْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ (۵۳/۲۳) چند نام ہیں جو تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ہمارے ہاں تو نظریہ کی حالت یہی ہو چکی ہے۔ چند الفاظ ہیں جنہیں دہرا لیا جاتا ہے۔ ایک رسم ہے جسے ادا کر لیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے اسلامک آئیڈیالوجی یا نظریہ پاکستان یہ ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

ہم صدر محترم سے بادب پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیا آپ نے سمجھ سوچ کر اس بات کا حلف لیا ہے کہ آپ اس نظریہ کو پاکستان میں عملاً نافذ کر کے اپنی زندگی بھی اسی قالب میں ڈھالینگے اور معاشرہ کا نظام بھی اس کے مطابق متشکل کریں گے؟ اس نظریہ کے تحفظ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں۔ زیرِ نظر آئین میں (۱۹۵۶ء کے آئین کے تتبع میں) جو کہا گیا ہے کہ

خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے جو حقِ حکومت اہلِ پاکستان کو حاصل ہو گا وہ ایک مقدس امانت ہے

اس کے معنی بھی یہی ہیں لیکن یہ الفاظ بھی آئین کی پیشانی پر اسی طرح تبرکاً لکھ دیئے گئے ہیں جس طرح ہم خط کے اوپر "۷۸۶" لکھ دیتے ہیں۔ آئین کے متن میں اس اجمال کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ بادی النظر میں بھی دیکھئے تو یہ بات عجیب سی لگے گی کہ نظریہ اسلام کے تحفظ کی حلف برداری اور اس کے جزوِ لاینفک دو قومی نظریہ کی عملی تردید — بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

۲۔ عدلِ عمرانی

پیپلز پارٹی کا دعویٰ ہے (جو صحیح نہیں) کہ ہم "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے اسے استعمال کیا تھا۔ ہمیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں اس آئین میں بھی ایسا نہ لکھ دیں۔ یہ غنیمت ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے (سابقہ دساتیر کے اتباع میں) یہی کہا ہے کہ:

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایک ایسی جمہوری مملکت ہو گی جو عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو گی۔

اس سے آگے کہا گیا ہے کہ:

> یہ مملکت، اسلام کے بیان کردہ جمہوریت، آزادی، مساوات، بردباری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں پر کامل طور پر عمل پیرا ہوگی۔

ان اصولوں کی وضاحت کہیں نہیں کی گئی۔

۳- مملکت کا نام

یہ غنیمت ہے کہ مملکت کا نام ---- اسلامک ری پبلک اوف پاکستان ---- رکھا گیا ہے۔

بعض حضرات ہم سے کہا کرتے ہیں کہ ایک طرف تو تم اٹھتے بیٹھتے یہ کہتے رہتے ہو کہ پاکستان (بلکہ ساری دنیا) میں اسلام کہیں نہیں اور مسلمان محض نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ اور دوسری طرف تم اس پر اظہارِ اطمینان کرتے ہو کہ مملکت کا نام "اسلامی جمہوریہ" رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ (مثلاً) آپ ہندوؤں کے محلہ میں رہیں۔ سارے کام ہندوؤں جیسے کریں، لیکن اپنا نام "عبدالرحمٰن" رکھیں تو ہندو آپ کو کبھی اپنوں میں سے نہیں سمجھے گا۔ اپنے سے غیر ہی تصور کریگا۔ گویا محض اس نام سے آپ کا جداگانہ تشخص "قائم" رہے گا۔ جونہی آپ نے اپنا نام بدل کر ---- رام داس ---- رکھا، آپ کا جداگانہ تشخص ختم ہوگیا۔ آپ ہندوؤں میں ضم ہو گئے۔ بعینہٖ یہی کیفیت مملکت کی ہے۔ پاکستان میں صحیح اسلام نہ ہو، ہم حقیقی معنوں میں مسلمان بھی نہ ہوں، لیکن جب تک ہماری مملکت کا نام "اسلامی" ہوگا اس کا جداگانہ تشخص قائم رہے گا۔ جونہی آپ نے اسے "سیکولر سٹیٹ" کہا، اس کا امتیازی نشان مٹ گیا۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ بھارت نے (نام نہاد) "بنگلہ دیش" کا نام "اسلامی مملکت" نہیں رکھنے دیا۔ اس سے وہ "بنگلہ دیش" کو اپنوں میں سے سمجھتا ہے اور پاکستان کو غیروں میں سے۔ (جیسا کہ پرویز صاحب نے اپنے کنونشن کے خطاب ---- چراغِ آرزو ---- میں بتایا) قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد بھارت کے سب سے زیادہ بااثر روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا۔

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جاتے اور پاکستان اسلامک اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

ہم شکر گزار ہیں مسٹر بھٹو کے کہ انہوں نے کم از کم مملکت کے نام کے امتیازی نشان کو برقرار رکھا ہے۔

---- (۰) ----

۴- اسلامی قوانین

یہ دیکھ کر بہیں افسوس ہوا کہ قانون سازی کے سلسلہ میں دین کے ساتھ جو مذاق پچیس سال سے ہوتا چلا آرہا ہے زیرِ نظر آئین میں بھی اسے علیٰ حالہ برقرار رکھا گیا ہے۔ قریب بیس سال ادھر کی بات ہے۔ جب مجلس آئین ساز میں پہلے پہل یہ تجویز پیش ہوئی کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا تو ہم نے کہا کہ یہ تجویز ناممکن العمل ہے۔ کتاب و سنت کی رو سے کوئی

ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس پر مذہبی پیشوائیت نے شور مچا دیا۔ ہمیں منکرِ حدیث، منکرِ رسالت، ملحد، بے دین، کافر اور نہ معلوم کیا کیا کچھ کہا گیا۔ لیکن ہم اپنی پکار کو برابر دہراتے گئے۔ ادھر ارباب حکومت بھی چونکہ اس باب میں سنجیدہ (SERIOUS) نہیں تھے کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہوں اس لئے انہوں نے اس تجویز کو اپنے حسب منشا سمجھا اور اسے آئینِ پاکستان میں داخل کر لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ شق داخلِ آئین تو رہی لیکن اس پر عمل کسی ایک دن بھی نہ ہو سکا۔ بالآخر اگست ۱۹۶۰ء میں ہمارے خلاف ایجی ٹیشن کرنے والوں کے سرخیل ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رُو سے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

اور تماشہ یہ کہ ایک طرف یہ کہا اور دوسری طرف حکومت کے پاس یہ تجویز بھیجدی کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ ملک میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی قانون رائج نہیں ہوگا۔

انہوں نے یہ تجویز بھیجی اور حکومت نے اسے جھٹ سے آئین میں داخل کر لیا!

کہیئے کہ یہ دین سے مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اور پھر اس آئین میں اس مسئلہ سے مذاق در مذاق ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں اس شق کو متنِ آئین کا جزو بنایا گیا تھا اس لئے اس کی کم از کم آئینی اور قانونی حیثیت مسلّم تھی لیکن موجودہ آئین میں اسے "پالیسی کے اصولوں" کے ذیل میں رکھا گیا ہے اور ان اصولوں کے متعلق آرٹیکل (۲) ۲۸ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ نہ ان کی کوئی قانونی حیثیت ہے اور نہ ہی ان کی خلاف ورزی کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے یعنی ان اصولوں کی حیثیت صرف وعظ کی سی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا گیا ہے کہ ہر سال مرکزی اور صوبائی حکومتیں ایک رپورٹ مرتب کریں گی کہ ان اصولوں پر کس حد تک عملدرآمد ہوا اور اس رپورٹ پر مرکزی اور متعلقہ صوبائی اسمبلی میں بحث ہو سکے گی۔

۵۔ مذہبی فرقے

۱۹۵۶ء کے آئین میں کہا گیا تھا کہ پرسنل لاز (شخصی قوانین) ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں یہ شق موجود نہیں تھی لیکن بعد میں مذہبی پیشوائیت کے اصرار پر ایک ترمیم کے ذریعے یہ شق (جسے قرآن بنصِ صریح شرک قرار دیتا ہے) شاملِ آئین کر دی گئی تھی۔ حالیہ آئین میں "مذہبی فرقہ" کی جگہ "مکتبِ فقہ" (SCHOOL OF LAW) کہا گیا ہے اور اس طرح (شاید) اپنے آپ کو فریب دے لیا گیا ہے کہ ہم نے "فرقوں" کو تسلیم نہیں کیا۔

یاد رکھیے قرآن کریم کی رُو سے:

(۱) پبلک لاز اور پرسنل لاز میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

(۲) امت میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ اور

(۳) اسلامی مملکت کے اندر مختلف مکاتبِ فقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو قوانین اس مملکت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں وہی رائج الوقت فقہ اور شریعت ہوتی ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔

پالیسی کے اصولوں کی ایک شق یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ، مساجد، اور اوقاف کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔

(باقی (ص ۳۰)

قرآن کی رُو سے وقف کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ باقی رہی زکوٰۃ اور مساجد، سو ان حضرات کے ذہن میں ان کا وہی مفہوم ہے جو مروجہ مذہب نے عام کر رکھا ہے۔ اسلامی نظام میں ان کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ ان موضوعات پر طلوعِ اسلام میں اس کثرت سے لکھا جا چکا ہے کہ اس کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

انہی اصولوں کے تحت یہ بھی کہا گیا ہے کہ زنا۔ جوا۔ اور شراب کی حوصلہ شکنی (DISCOURAGED) کی جائیگی۔ (آرٹیکل ۳۷ و ۳۸)

۶۔ صدارتی نظام

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے اس آئین میں نظام حکومت صدارتی تجویز کیا گیا ہے۔ ہم تو شروع سے (قرآنی شرائط سے مشروط) صدارتی نظام کے حق میں ہیں۔ لیکن جو پارٹیاں اس کی مخالفت کرتی ہیں ہم ان سے کہیں گے کہ جب وہ مغرب کے جمہوری نظام کو تسلیم کر چکے ہیں تو پھر اس نظام کی مخالفت کس طرح کی جا سکتی ہے۔ مغربی نظامِ جمہوریت کی رُو سے اکثریتی پارٹی کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس انداز کا نظام چاہے وضع اور اختیار کرے۔ اقلیت کو آئینی طور پر اس نظام کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہی تو مغربی نظامِ جمہوریت کی وہ لعنت ہے جس سے ملک میں کبھی امن و سکون قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآنی جمہوریت (نظامِ شوریٰ) "کنٹرولڈ" ہوتی ہے یعنی اس میں نمائندگانِ ملت کو قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے "آئین اور قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جس طرح کا جی چاہے آئین یا قانون نہیں بنا سکتے۔ تبرکاً تو (سابقہ آئینوں کی طرح) اس آئین میں بھی یہ درج ہے کہ مملکت کو حق حکومت صرف ان حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہو سکتا ہے جو خدا نے متعین کی ہیں لیکن عملاً اس کے مطابق کبھی نہیں ہوتا۔ اگر ہماری جمہوریت اس آئینی شق سے کنٹرولڈ رہے تو پھر کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی۔

۷۔ فیڈریل سسٹم

جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، اس آئین میں نظام مملکت فیڈریل تجویز کیا گیا ہے جس کی رُو سے صوبوں کی انتظامی لکیریں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جاتی ہیں اور اس کا اگلا قدم (مشرقی پاکستان کی طرح) مطالبہ کامل خود مختاری کے بعد علیحدگی کا رجحان ہوتا ہے۔ وحدانی انداز حکومت (UNITARY FORM OF GOVT:) میں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ممکن ہے، فیڈریل نظام میں صوبجاتی تعصبات اور باہمی مفاد کے تصادمات ہمیں تباہی کی طرف لے جائینگے۔ ہماری نجات کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان —

ایک قوم — ان سب کے لئے ایک ضابطہ قوانین۔ اور ان سب کی ایک مشترک (وحدانی) حکومت۔

۸۔ عورتوں کے حقوق

آرٹیکل (۳۲) میں کہا گیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں عورتوں کی شمولیت کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں — یہ غنیمت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ شق "پالیسی کے اصولوں" کے ذیل میں رکھی گئی جس کی حیثیت (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) محض وعظ کی ہے، قانون کی نہیں۔

۹۔ معاشی نظام

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اس آئین میں نہ اسلام ہے نہ سوشلزم۔ "اسلام" کی بابت تو ہم دیکھ چکے ہیں۔ جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، "بنیادی حقوق" میں کہا گیا ہے۔

ان معقول پابندیوں سے مشروط جو بذریعہ قانون عائد کی جائیں، ہر شہری کو پراپرٹی حاصل کرنے، اسے اپنے قبضہ میں رکھنے اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ (آرٹیکل ۲۴)

اس سے اگلی شق میں کہا گیا ہے۔

کسی شخص کو غیر قانونی طور پر پراپرٹی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ ایسا مفاد عامہ (PUBLIC PURPOSE) کے لئے مناسب معاوضہ دیکر کیا جا سکے گا۔ (آرٹیکل ۲۴)

اور "پالیسی کے اصولوں" کے تابع (جن کی حیثیت وعظ کی سی ہے) کہا گیا ہے۔

دولت کے بے جا ارتکاز، اور ذرائع پیداوار اور تقسیم کو چند نفوس کے قبضے میں چلے جانے کو روکا جائے تاکہ اس سے عوام کی معاشی حالت بہتر بنائی جا سکے

جو لوگ کسی وجہ سے کسب معاش سے معذور ہو جائیں انہیں بنیادی ضروریات زندگی مہیا کی جائیں۔

(۳) ربٰو (یعنی USURY) کو ختم کیا جائے۔

اس قسم کی شقیں دنیا کی ہر رفاہی مملکت کے آئین میں موجود ہوتی ہیں جنہیں نظام سرمایہ داری کی حامل کہہ کر دھتکار دیا جاتا ہے اور یہ خود ان سابقہ آئینوں میں بھی موجود تھیں جنہیں نظام سرمایہ داری کے آئینہ دار قرار دیا جاتا تھا۔ لہٰذا جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں اور نظام سرمایہ داری میں فرق کیا ہے؟

(۱۰)

یہ ہیں وہ چند موٹے موٹے نکات جن کے متعلق ہم نے اصولی طور پر بات کرنا ضروری سمجھا ہے۔ جہاں تک ایک ایسے آئین کا تعلق ہے جسے ہماری بصیرت قرآنی کے مطابق اسلامی مملکت کی بنیاد قرار پانا چاہیئے، اس کے متعلق ہم گزشتہ بیس سال سے شرح و بسط سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے آخری مرتبہ فروری ۱۹۷۰ء کے طلوع اسلام میں "قرآنی آئین کے بنیادی اصول" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا۔ بعد میں اس مقالہ کا انگریزی زبان میں پمفلٹ بھی شائع کر دیا گیا تھا جسے بکثرت تقسیم کیا گیا تھا۔ ہم نے اب پھر اس پمفلٹ کی کاپیاں ان تمام افراد اور گوشوں تک پہنچا دی ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح تعلق آئین سازی سے ہے۔ ہم اس سے زیادہ کچھ اور کر نہیں سکتے۔ ہمارے لئے مشکل ہے کہ ہم اس مقالہ کو طلوع اسلام میں دوبارہ شائع کریں (کاغذ کی قلت ہمارے کئی عزائم کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے)۔ البتہ قارئین کی تجدید یادداشت کے لئے اس کی مختلف شقوں کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (تفصیل طلوع اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۰ء میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

۱۔ اقتدار اعلیٰ اس مملکت میں اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہوگا جس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ حکومت خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی قانون

حکم یا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

۲۔ قانون سازی مملکت کے قوانین کی اساس قرآن کریم ہوگی اور مجلسِ قانون ساز اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قانون مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

۳۔ فیصلہ کن ادارہ اس آئین کے تابع ایک لا کمیشن مقرر کیا جائے جو ملک کے مروجہ قوانین کا قرآن مجید کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ نیز جو قانون آئندہ بھی زیرِ تدوین آئے، وہ اسکے متعلق بھی قرآنی روشنی میں اپنی سفارش پیش کرے۔
اس سوال کا فیصلہ کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، مملکت کی عدالت عالیہ کریگی جس میں قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بطور وکیل پیش ہو سکینگے۔

۴۔ دو قومی نظریہ مملکت میں بسنے والے غیر مسلم مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پا سکتے اس لئے انہیں امورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وہ اس کی پارلیمان کے ممبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان ممبروں کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مملکت کی ان اسامیوں پر بھی تعینات نہیں کئے جا سکتے جن کا تعلق رموزِ مملکت سے ہو۔ انہیں صرف وہ مراعات حاصل ہونگی جن کی تشریح شق ۱۳ میں کی گئی ہے۔

۵۔ فرقے اور پارٹیاں ۱۔ قرآن کی اساس پر مملکت کے لئے جو قانون مرتب کیا جائے گا اسکا اطلاق ملک کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں ہوگا۔
۲۔ سیاسی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔

۶۔ بین الملّی تعلقات دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کیساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد قرآن کا یہی اساسی اصول ہوگا۔

۷۔ نظامِ حکومت (۱) نظامِ حکومت وحدانی ہوگا۔
(۲) پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک ایوانِ عام، ابنائے ملت پر مشتمل اور دوسرا خاص صلاحیتوں کے اہلِ اعیانِ امت پر۔

(۳) پارلیمان کے ایوانوں میں پارٹیوں کا وجود قانوناً ممنوع ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور حزبِ موافق اور حزبِ مخالف کا غیر اسلامی تصور کارفرما نہیں ہوگا۔

۸۔ معیارِ اہلیت صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ)، ارکانِ مجالسِ مقننہ (پارلیمان)، اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت اور ان دیگر افراد پر جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں، حسبِ ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

۱۔ قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

۲۔ متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی کماحقہٗ اہلیت۔

۳۔ صالحیت یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

۴۔ ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر، معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اس کا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا، اسی طریق سے اسے معطل یا برطرف کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ تعلیم قوم کے بچوں کی (از اوّل تا آخر تک) تعلیم کی ذمہ داری، انفرادی طور پر والدین کی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہوگی۔ نظامِ تعلیم میں، مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائے گا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

۱۰۔ نظامِ عدل معاشرتی اور قانونی عدل، مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے۔ اور ان کے عدمِ حصول کی صورت میں، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے گا۔

قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ معاملہ کا فیصلہ قانون کی رُو سے ہوگا اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

۱۱۔ نفسیاتی تبدیلی مملکت میں کوئی فرد نہ کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔ اس میں حکومت صرف قانون کی ہوگی جس سے کوئی شخص بھی بالا نہیں ہوگا۔ مملکت، عدل و احسان کی عام کارفرمائی سے ملک میں ایسی فضا پیدا کرے گی جس سے قانون کا احترام افرادِ مملکت کے دل کی گہرائیوں کا تقاضا بن جائے اور اس طرح ہر شخص بلا خوف و حزن زندگی بسر کرے۔

۱۲۔ معاشی نظام ہر فرد، اپنی اپنی استعداد کے مطابق، وہ کام کرے جسے اس کی اہلیت و صلاحیت

کے پیش نظر اس کے سپرد کیا گیا ہو اور ہر ایک کی ضروریات زندگی مملکت کیطرف سے پوری ہوتی رہیں ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے وسائل پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے۔ یہ انفرادی ملکیت میں نہیں رہ سکیں گی۔

۱۳۔ غیر مسلموں کے حقوق مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، امور مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکینگے کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوق انسانیت حاصل ہونگے۔ ان کی جان، مال، آبرو، پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرنے میں ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائیگی۔

اسکے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کیطرف مستقل طور پر منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنے ہاں بسانے پر آمادہ ہو تو اسلامی مملکت انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام کریگی۔

لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین و قوانین سے سرکشی برتیں گے تو انہیں اس بغاوت کی وہی سزا دی جائے گی جو مسلمان باغیوں کے لئے ہوگی۔

(اس سفارش میں بنیادی حقوق کی فہرست بھی دی گئی تھی جسے دہرانے کی ضرورت نہیں)

(۰)

یہ ہیں وہ اصول جن کے مطابق (ہماری بصیرت قرآنی کی رُو سے) مملکت پاکستان کا آئین مرتب ہونا چاہیئے۔ اسوقت حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر ہے جو عبوری آئین کی روشنی میں مستقل آئین کا مسودہ مرتب کر رہی ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ ہماری مملکت کا مستقل آئین ان خطوط پر مرتب ہونا چاہیئے جو اوپر دیئے گئے ہیں تو آپ کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اس مضمون کا ایک خط لکھیں کہ:-

ہم چاہتے ہیں کہ مملکت پاکستان کا مستقل آئین ان خطوط کے مطابق مرتب ہو جنہیں ادارہ طلوع اسلام، گلبرگ لاہور کیطرف سے اُس پمفلٹ میں وضع کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے۔

OUTLINES OF QURANIC CONSTITUTION

اور جنہیں مجلہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت جون ۱۹۷۲ء میں دہرایا گیا ہے۔

اور اس خط کو ذیل کے پتہ پر بھیجدیں۔

سیکرٹری - کانسٹی ٹیوشن میکنگ کمیٹی۔
معرفت - منسٹری آف لاء۔
حکومت پاکستان - اسلام آباد

یاد رکھیئے کہ اس کمیٹی نے ۱۵ جون تک اپنی سفارشات مرتب کر لینی ہیں اس لئے یہ خط بلا تاخیر لکھ دینا چاہیئے۔ آپ اتنے سے تعاون سے خدا کے ہاں یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہم نے قرآنی آواز کو متعلقہ گوشے تک پہنچا دیا تھا۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہ۔

(۰)

حقائق و عبر

۱۔ مفتی محمود صاحب

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اگر وہ آج زندہ ہوتے تو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ انہی "امّہ دو رکعت" میں سے ایک صاحب مغربی پاکستان کے ایک صوبہ (سرحد) کی وزارتِ عالیہ کی مسند پر متمکن ہو گئے ہیں۔ ہم اس حادثۂ عظمیٰ پر سوائے اس کے کہ اہلِ سرحد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں اور کیا کر سکتے ہیں! یہ درحقیقت نتیجہ ہے اس مغربی جمہوریت کی لعنت کا جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے۔

مفتی صاحب نے قلمدانِ وزارتِ عالیہ سنبھالتے ہی پہلا فتویٰ یہ صادر فرمایا کہ سرحد میں شراب بالکل ممنوع ہو گی۔ بہت اچھا کیا۔ شراب کو قرآن کریم نے رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (۵/۹۰) کہا ہے اور اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے لیکن قرآن مجید نے صرف شراب کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس نے (خمر) کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں ہر نشہ آور شے شامل ہے۔ صوبہ سرحد میں شراب کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ وہاں چرس کا رواج عام ہے۔ نیز جس آیت میں خمر کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس میں میسرہ کو بھی اسی زمرہ میں شامل کیا گیا ہے۔ میسرہ کو عام طور پر جوئے (قمار بازی) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیا مفتی صاحب چرس اور جوئے کو بھی اسی طرح قانوناً ممنوع قرار دینگے یا محض شراب کی بندش سے سستی شہرت حاصل کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ امتناعِ شراب کے بعد وہاں سستی منشیات کا استعمال اور زیادہ ہو گیا ہے۔

(۲) خمر کے متعلق تو قرآن کریم نے "من عمل الشیطٰن" ہی کہا ہے لیکن اس میں ایک اور جرم کا بھی ذکر ہے جسے اس نے شرک قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ شرک خود قرآن کریم کی رُو سے سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ جرمِ عظیم یہ ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲) (مسلمانو! دیکھنا۔ کہیں ایمان لانے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی انہی فرقوں میں سے ایک فرقہ بن گئے۔ پھر ان فرقوں کی ذہنیت یہ ہو گئی کہ ہر ایک اپنے اس خیال میں مگن ہو کر بیٹھ گیا کہ میں حق پر ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ کیا مفتی صاحب اس شرک کو مٹانے کے لئے یہ حکم بھی صادر فرمائینگے کہ کوئی مسلمان نہ اپنے کو شیعہ کہے نہ سُنی۔ نہ حنفی کہے نہ اہلِ حدیث۔ نہ دیوبندی کہے نہ بریلوی!

(۳) مفتی صاحب دیوبند سے متعلق ہیں اور دیوبند والوں نے مسلمانوں کے اکثر فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے عاید کر رکھے ہیں۔ کیا مفتی صاحب یہ حکم صادر فرمائینگے کہ وہ تمام فرقے جن کے خلاف دیوبندی علماء نے کفر کے فتاویٰ صادر کر رکھے ہیں امت مسلمہ سے خارج ہیں؟

(۴) قرآن کریم نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کی عظیم تقریب پر اپنے خطبہ میں نسبی امتیازات کو مٹا دینے کا اعلان فرما دیا تھا۔ کیا مفتی صاحب یہ حکم صادر فرمائینگے کہ صوبہ سرحد میں کوئی شخص نہ اپنے آپ کو پٹھان کہے نہ سید، نہ شیخ کہے نہ اعوان!

(۵) قرآن کریم نے پارٹی بازی کو فرعونی سیاست کہہ کر پکارا ہے (۲۸/۴)۔ کیا مفتی صاحب (سرحد میں) اپنی پارٹی سمیت تمام پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دیں گے!

سردست ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ جب وہ ان احکام خداوندی اور سنت رسول اللہؐ پر عمل پیرا ہو جائینگے تو ہم ایک اور فہرست پیش کر دینگے۔

مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "قرآن کے حکم کے مطابق مرتد کی سزا موت ہے۔" (نوائے وقت ۱۸/۴) کیا مفتی صاحب براہ کرم قرآن کی اس آیت کا حوالہ دینگے جس میں مرتد کی سزا موت بتائی گئی ہے۔؟

(۱)

۲۔ مینار بابل

صوبائی حکومتوں کے قیام کے بعد بلوچستان سے سب سے پہلے یہ آواز بلند ہوئی کہ وہاں کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ پھر صوبہ سرحد سے اس کی صدائے بازگشت میں مفتی محمود صاحب نے ارشاد فرمایا کہ صوبہ سرحد کی سرکاری زبان بھی اردو ہوگی (اگرچہ وہاں کے گورنر نے کہا ہے کہ اس امر کا فیصلہ اسمبلی کرے گی)۔ بایں ہمہ ہم میر غوث بخش خان بزنجو اور مفتی صاحب کی خدمت میں ان اعلانات پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

اس کے برعکس پنجاب کے گورنر غلام مصطفےٰ کھر صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ امر زیر غور ہے کہ پنجاب کی سرکاری زبان اردو ہونی چاہیئے ۔۔۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ اس صوبہ کے متعلق فرمایا گیا ہے جہاں نصف صدی کے قریب محکموں کا کاروبار انگریز کے زمانے سے اردو میں ہوتا چلا آرہا ہے اور جسے اس حقیقت پر بجا طور پر فخر ہے کہ اس نے اردو کے فروغ اور توسیع کے لئے خود اہل زبان سے بھی زیادہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ یہاں کے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد صاحب نے اپنے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ پنجاب کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہاں کی سرکاری زبان اردو ہوگی سوال صرف یہ سامنے لانا چاہیئے کہ اردو کو عملاً سرکاری زبان کس طریق سے بنایا جائے۔ ہم محترم ملک صاحب کی خدمت میں بھی ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

اب رہا سندھ، سو اس سلسلہ میں جی۔ ایم۔ سید صاحب کے تازہ ترین ارشادات ملاحظہ فرمایئے جو روزنامہ مساوات (لاہور) کی ۱۷ اپریل ۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔

کراچی ۱۶ اپریل (اپ پ) سندھ متحدہ محاذ کے صدر مسٹر جی۔ ایم۔ سید نے آج یہاں کہا کہ اردو "غیر ملکی زبان"

ہے اور اگر اسے قومی زبان کی حیثیت سے ٹھونسا گیا تو ہم اس کی شدید مخالفت کریں گے۔ وہ سندھی ادبی سنگت کے ایک کنونشن سے خطاب کر رہے تھے۔ اس کنونشن کی تمام کارروائی سندھی زبان میں ہوئی۔ مسٹر جی۔ ایم۔ سید نے کہا کہ اب پاکستان چار قومیتوں پر مشتمل ہے۔ ہر قومیت کی اپنی زبان اور اپنی ثقافت ہے۔ اردو کسی بھی قومیت کی زبان نہیں۔ آپ نے کہا کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت دینے سے ہی مشرقی پاکستان الگ ہوا۔ اور اب اگر اسے مغربی پاکستان کی قومی زبان بنایا گیا ہے تو چاروں قومیتوں کو یہ سوچنا پڑے گا کہ کیا وہ اپنی اپنی زبان اور اپنی ثقافت کی قربانی دینے کو تیار ہیں یا نہیں۔ آپ نے کہا کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت دینے سے ملک میں انتشار پھیل جائیگا۔ اردو نے پہلے تو ہندوستان کو تقسیم کیا اور پھر پاکستان کے دو ٹکڑے کرائے۔ پاکستان کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اردو کو قومی زبان نہ بنایا جائے۔ مسٹر سید نے اردو کو نئے سامراجیوں کی زبان قرار دیا اور سندھی نوجوانوں کو ہدایت کی کہ وہ اردو کے نفاذ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ کنونشن سے شیخ مجیب کی عوامی لیگ کے سابق نائب صدر قاضی فیض احمد۔ محمد نذیر چنا۔ انور۔ نظامانی۔ ڈاکٹر تنویر عباسی۔ لالی کانو اور مسعود نورانی نے بھی خطاب کیا۔

زبان کے سلسلہ میں ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سرکاری زبان تو اردو ہی ہونی چاہیئے لیکن یہاں انگریزی زبان کی اہمیت کو کم نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ انگریزی کسی قوم کی بھی زبان ہو اس نے اپنی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی ہے، کہ اس سے بے بہرہ رہنے والا کسی عالمگیر اسٹیج پر گونگا بن کر رہ جاتا ہے، اور یہ کمی بہت بڑے قومی نقصان کا موجب بنتی ہے۔ اس کا فی الفور خیال رکھنا چاہیئے۔

(۰)

۳۔ شیر آیا شیر آیا!

پرویز صاحب نے اپنے کنونشن کے خطاب میں (جو طلوع اسلام کی مئی ۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) اس حقیقت کی نقاب کشائی بھی فرمائی کہ تشکیل پاکستان کے روزِ اوّل سے لیکر آج تک ہر حکومت نے اعلان کیا کہ ملک میں بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ موجود ہیں بعض پارٹیوں کو پاکستان دشمن عناصر کی طرف سے مالی امداد بھی ملتی ہے۔ یہاں جاسوس اور غدار عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر حکومت نے اس قسم کے اعلانات کئے لیکن کسی حکومت نے نہ ان ملک دشمن عناصر کی نشاندہی کی، نہ ان کے خلاف مقدمات چلائے نہ کسی کو تختۂ دار پر لٹکایا اور اعلانات یونہی ہوتے رہے۔ پرویز صاحب ابھی یہ کچھ کہہ رہے تھے اور ادھر اخبارات میں بلوچستان کے راہنما اکبر بگٹی کے وہ بیانات شائع ہو رہے تھے جنہیں مملکتِ پاکستان کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ (ملاحظہ فرمایئے۔ نوائے وقت۔ ۲۰ مئی، یکم جون) کچھ دنوں تک ان بیانات کا ملک میں کافی چرچا رہا۔ دوڑیو۔ پکڑیو۔ جانے نہ پائے کی آوازیں بلند ہوئیں — اس کے بعد فضا پر پھر وہی خاموشی چھا گئی اور اب کسی کو یاد تک نہیں کہ بگٹی صاحب نے کیا کہا تھا۔ اب وہ کہاں ہیں۔ کیا ان کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا؟

۲۔ روزنامہ جنگ (کراچی) کی ۸ مئی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں "سندھ میں بھارتی ایجنٹ" کے عنوان سے اداریہ شائع ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

سندھ کے وزیرِ اعلیٰ جناب ممتاز علی بھٹو نے "سندھو دیش" کا نعرہ لگانے والی انتہا پسند اقلیت کی بروقت نشاندہی کی ہے۔ یہ خطرناک اقلیت انہی راستوں پر گامزن ہے جن پر چل کر ایک انتہا پسند گروپ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرا چکا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ نے انکشاف کیا ہے کہ (۱) سندھو دیش کا نعرہ لگانے والے بھارتی ایجنٹ ہیں۔ (۲) ان عناصر کی تحریک پورے طور سے پاکستان دشمن تحریک ہے۔ اور یہ کہ (۳) اس تحریک کو بھارت سے مالی امداد مل رہی ہے۔

یہ تحریک اس صوبہ میں پرورش پا رہی ہے جس میں ملک کی اکثریتی پارٹی (پیپلز پارٹی) برسرِ اقتدار ہے اور اس کی نشاندہی کر رہے ہیں وہاں کے گورنر صاحب۔ لیکن اس کے بعد کسی نے قوم کو کچھ نہیں بتایا کہ اس تحریک کے خلاف کیا اقدامات کئے جا رہے ہیں: قوم کو معلوم ہے تو اتنا ہی کہ اس تحریک کے سرپرست جی۔ ایم۔ سید صاحب بدستور دندناتے پھر رہے ہیں۔

(۳) ۲۱ مئی ۱۹۷۲ء کے روزنامہ مساوات کے اداریہ میں جماعتِ اسلامی کا نام لے کر اس کے خلاف یہ الزام عاید کیا گیا ہے کہ وہ ملک میں امریکی جاسوسی کا کام کر رہی ہے۔ اس ضمن میں اس کا تازہ ترین کارنامہ یہ بتایا گیا ہے کہ پی۔ آئی۔ اے کے جو طیارے چین کی سرزمین پر اڑان کرتے ہیں وہ چین کے خفیہ راز حاصل کرنے کے ایجنٹ ثابت ہوئے ہیں۔ اداریہ کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں۔

اگر عوامی چین ہم سے شکایت نہ کرتا تو شاید ہمیں یہ بھی نہ چلتا کہ پی۔ آئی۔ اے کے طیارے سنکیانگ پر پرواز کرتے وقت ان خفیہ کیمروں کے ذریعے جو طیاروں کے نیچے فِٹ کر دیئے جاتے ہیں، پاکستان سے چین کے نو دہ ہزار راستے کے ہر موڑ اور سنکیانگ میں چینی ایٹمی تجربہ گاہوں کی ہر تفصیل کھینچ لیتے ہیں جسے مقناطیسی لہروں کے ذریعے ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ یہ ٹیپ ایٹمی خاک کے ذرّے بھی چن لیتا ہے جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چین ایٹمی ترقی کی کس منزل پر ہے۔

اس کے بعد اس اداریہ میں لکھا ہے کہ

جاسوسی کی تحقیقات مکمل ہو چکی ہے۔

یہ جرم کس قدر سنگین ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ایک ہی ملک (چین) ہے جس کی حمایت پر ہم پورا پورا بھروسہ کر سکتے ہیں اور جس نے ہر آڑے وقت میں ہماری بھرپور مدد کی ہے۔ یہ جاسوسی اُس ملک کے خلاف کی گئی ہے۔! آپ سوچئے کہ اس کے بعد وہ ملک، ہم پر ایک ثانیہ کے لئے بھی اعتماد کر سکے گا؟ اور ہمارا دوست اور حامی رہ سکے گا؟

اور ملک کو قطعاً معلوم نہیں کہ تحقیقات کے نتیجہ میں مجرم کون ثابت ہوا اور ان کے خلاف اقدامات کیا کئے گئے؟

اور ملک کی یہ ناواقفیت صرف اس ایک حادثہ کے سلسلہ میں ہی تھوڑی ہے۔ یہاں ہو ہی یہ رہا ہے۔

(۱) شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف اگرتلہ کیس چلا۔ کسی کو معلوم نہیں اس میں کیا کیا انکشافات ہوئے۔

(۲) مجیب ہی کے خلاف ۱۹۶۸ء میں مقدمہ چلا تھا۔ روداد کا ملک کو کچھ علم نہیں۔

(۳) یحییٰ خان وغیرہ کے خلاف تحقیقات کے لئے حمود الرحمٰن کمیشن قائم ہوا۔ کسی کو علم نہیں کہ انکی تحقیقات کا نتیجہ کیا ہے۔

(۴) اکبر بگٹی نے ایسے بیانات دیئے جو کھلی ہوئی بغاوت پر مشتمل تھے۔ ملک کو کچھ علم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا؟

(۵) سندھ میں علیحدگی پسندوں کی تحریک کی نشاندہی خود وہاں کے گورنر نے کی۔ لیکن ملک کو کچھ معلوم نہیں کہ اس

کے خلاف کیا اقدامات کئے گئے۔

(۶) اخبارات کی خبروں کے مطابق عبدالغفار خان صاحب واپس پاکستان آرہے ہیں۔ ملک کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ اتنا عرصہ ملک سے باہر کیوں رہے۔ ان کی تحریک (سرخ پوشاں) کو قانوناً ممنوع کیوں قرار دیا گیا تھا۔ اور اب وہ پابندی اٹھا کیوں لی گئی ہے۔ اب خان عبدالغفار خان کے عزائم کیا ہیں۔

قوم کو ان امور کے متعلق کچھ معلوم نہیں ..... اسی طرح جیسے بکریوں کے ریوڑ کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ گڈریا انہیں کدھر لئے جا رہا ہے۔ انہیں کس کے ہاتھوں اور کن داموں فروخت کیا جا رہا ہے اور قصاب کے ان کے متعلق کیا ارادے ہیں۔

۴۔ طالب علم یا فریق مقدمہ؟

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء کی یونین بنتی ہیں۔ پھر ان کے الیکشن ہوتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی یونین کا الیکشن گزشتہ اپریل میں ہوا تھا۔ اس میں کیا ہوا اس کے متعلق روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۲۹ اپریل کی اشاعت کے اداریہ میں جو کچھ لکھا تھا اس کا ملخص یہ ہے کہ

> کوئی دو سال ادھر ہوئے کہ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا احیاء ہوا تھا۔ اس کے بعد پہلا الیکشن ۱۹۶۸ء میں ہوا تھا۔ اس میں جو خون خرابہ ہوا تھا وہ سب کو یاد ہے۔ حالیہ الیکشن میں طلباء کے گروہوں میں باقاعدہ جنگ ہوئی جس میں اسلحہ کا کھلے بندوں استعمال کیا گیا۔ نتیجہ میں ایک طالب علم قتل ہو گیا اور بہت سے زخمی ہوئے۔ حکومت کو مجبوراً یونیورسٹی اور کالجوں کو بند کرنا پڑا۔

یہ تو الیکشن کی بات ہے۔ طلباء کی یونین کے متحارب گروہوں میں سال بھر کسی نہ کسی رنگ میں تصادم ہوتا رہتا ہے جن کی وجہ سے علاوہ دیگر اتفاقات، سال میں نو ماہ سے زیادہ عرصہ تک تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ برسوں سے ہو رہا ہے۔ اور ارباب نظم و نسق اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان یونینز کی بالآخر ضرورت کیا ہے۔ مزدوروں اور دیگر اہل حرفہ کی یونینز کی وجہ جواز سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان کے مفادات کا تصادم مالکان یا انتظامیہ سے ہوتا رہتا ہے اور ان کے تحفظ کے لئے انہیں اجتماعی اقدامات کی ضرورت پڑتی ہے۔ (اگرچہ اس کے لئے بھی گھیراؤ جلاؤ اور انتشار و خلفشار کی کوئی وجہ جواز نہیں ہوتی۔) لیکن طلباء کے کونسے مفادات ہیں جن کا تصادم اساتذہ وغیرہ سے ہوتا ہے اور جن کے تحفظ کے لئے انہیں اس قسم کی اجتماعی تنظیمات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ طالب علموں کی زندگی کا مقصد حصول علم ہوتا ہے اور بس۔ ان کی زندگی کے دیگر مقاصد حصول علم کا مرحلہ ختم ہو جانے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا جب تک وہ طالب علم ہیں انہیں حصول علم کے سوا کسی اور مقصد کو سامنے رکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ حصول علم کے سلسلہ میں کونسے ایسے مسائل سامنے آسکتے ہیں جن کے لئے انہیں اس قسم کے تصادمات کی ضرورت لاحق ہو۔ اچھے وقتوں میں (جن کے تذکرہ سے اب ہماری نئی نسل ناک بھوں چڑھاتی ہے) جماعت کلاس میں چھوٹی موٹی شکایات، اساتذہ یا ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کے نوٹس میں لے آتا تھا اور مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ لیکن اب طالب علم اپنے آپ کو طالبان علم نہیں سمجھتے۔ باقاعدہ سیاسی پارٹیاں تصور کرتے ہیں اور باہر کی سیاسی پارٹیاں انہیں اپنے "کارندوں" کی طرح استعمال کرتی رہتی ہیں۔ یہ سب کچھ یونینز کی وساطت سے ہوتا

ہے۔ اربابِ نظم و نسق سے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ طلباء میں یونینز کا سلسلہ قانوناً ختم کر دینا چاہیئے اور سٹوڈنٹس کو زمانہ طالب علمی کے دوران عملی سیاسیات میں حصہ لینے کی قطعاً اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ ان کی اجتماعی دشواریاں (اگر کوئی ہوں) کلاس کے مانیٹر کے ذریعے متعلقہ ذمہ دار اصحاب تک پہنچا دینی چاہئیں۔ یہ تمام ساری اور سیاست بازی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا معیارِ تعلیم پست سے پست تر سطح تک پہنچتا جا رہا ہے اور ہماری نئی نسل خلفشار اور انتشار کا مجسمہ بنتی چلی جا رہی ہے۔ اب تباہی کے اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیئے۔

(۰)

۵۔ مسلمانوں کی تباہی کا بنیادی سبب

جس دن سے ہم نے ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر اپنی آزاد مملکت قائم کی، ہندو نے تحقیق شروع کر دی کہ اس مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔ اس سلسلہ میں انکی نگاہ اسپین پر پڑی جہاں مسلمانوں نے صدیوں تک ایسی پرشکوہ حکومت کی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور اس کے بعد ان پر ایسی تباہی مسلط ہوئی کہ آج سارے اسپین میں مسلمانوں کی ایک قبر تک نظر نہیں آتی۔ ہندو نے سوچا کہ یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اسپین میں ایسا کس طرح سے ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے ایک نہایت قابل مدبر کو اسپین بھیجا کہ وہ وہاں کے حالات کا ذاتی مطالعہ کرنے کے بعد بتلائے کہ مسلمانوں کی اس قدر عبرت آمیز تباہی کی وجوہات کیا تھیں؟ اس نے وہاں قریب ایک سال تک قیام کیا اور واپس آ کر ایک مبسوط رپورٹ پیش کی جس کا ملخص یہ تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کا سبب ان کے غداروں کا وجود تھا۔ لہٰذا ہمارے لئے ضرورت ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ غدار پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ اس نتیجہ کی روشنی میں انہوں نے مشرقی پاکستان کو اپنی تجربہ گاہ بنایا اور اس میں انہیں جس قدر کامیابی ہوئی وہ دنیا کے سامنے ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ محقق کون تھا جس نے اسپین جا کر ایسی تحقیق کی تھی اور اس کے بعد اپنی تحقیق کے نتیجہ کو مشرقی پاکستان میں آزمایا تھا۔ یہ بزرگوار تھے مسٹر درگا پرشاد دھر، جو پچھلے دنوں اوم شانتی، اوم شانتی کا منتر جاپتے، مسز گاندھی اور مسٹر بھٹو کی ملاقات کا (بظاہر) ایجنڈا تیار کرنے پاکستان تشریف لائے تھے۔

یہ سوال اکثر سامنے آتا ہے کہ اس قوم (یعنی ہم سوختہ بدبختوں) میں اتنے غدار کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟ اسکی فرعی وجوہات تو بہت سی ہیں لیکن اصلی سبب یہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ اسلام کا نام زبان پر رکھا اور انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی اس کے خلاف بسر کی۔ قول اور عمل کے اس تضاد کا لازمی نتیجہ منافقت تھا اور جب منافقت کسی قوم کا اجتماعی شعار بن جائے تو اس کا فطری نتیجہ غداری ہوتا ہے۔

(۰)

۶۔ محبِ وطن پاکستانی: شیخ مجیب الرحمٰن نے حال ہی میں عالمی بنک کے نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے بلکہ بنگلہ دیش کو کبھی پاکستان کا حصہ نہیں سمجھا۔ لہٰذا میری حکومت نہ تو حکومتِ پاکستان کی "وارث حکومت" ہے، نہ پاکستان کے بیرونی قرضوں کی کسی قسم کی ذمہ داری قبول کر سکتی ہے۔" (مشرق - ۱۵ جون)

ذرا آواز دیجئے ان بزرگواروں کو جو اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ مجیب بہت بڑا محبِ وطن پاکستانی ہے۔

(۰)

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے

پاکستان کے متعلق

خدائی فیصلہ

(قسط اول)

(یہ خطاب اُس کنونشن کے لئے لکھا (اور چھاپا) گیا تھا جو اخیر نومبر ۱۹۷۱ء میں منعقد ہونی تھی۔ وہ کنونشن، جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے ملتوی ہوگئی اور ۲۰ تا ۲۳ اپریل ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوئی جس میں یہ خطاب پیش کیا گیا۔ اس دوران میں (یوں کہیے کہ) وہ خدائی فیصلہ جس کا اس میں ذکر ہے فطرت کی طرف سے صادر ہوگیا۔ بایں ہمہ وہ حقائق جن پر وہ فیصلہ مبنی تھا اپنی جگہ پر بدستور قائم ہیں۔ اس لئے اس خطاب میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

(پرویز)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ

پرویز

قرآن کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲۴) ہم نے تمہاری طرف واضح قوانینِ زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بھی۔ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرنے سے مقصد کیا تھا، یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا، وہ نتیجہ ہوتا ہے ان قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا جن کے مطابق یہ عظیم کارگہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی یونہی بلا اسباب رونما نہیں ہوجاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے، وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے، وہ زوال پذیر ہو کر رفتہ رفتہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے وہ قوانین بیان کئے ہیں جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے، اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے، اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں اور فلاں قوم نے اس کی مخالفت کی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ اور اس کے بعد وہ قومِ مخاطب اور آنے والی اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں "تم خود فیصلہ کر لو کہ تم زندہ اور پائندہ رہنا چاہتے ہو یا تباہ و برباد ہونا۔ اگر زندہ و شاداب رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کر لو۔ جس قسم کی تمہاری روش ہوگی اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔"

دیدۂ عبرت کشا!

دیکھئے! وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں سامنے لاتا ہے جب کہتا ہے کہ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں اور انہوں نے اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمتِ گزشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد ان کی تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں۔ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ۔ وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں جو اب تمہاری مخاطب ہے، اور قوت و حشمت میں بھی اس سے بڑھ کر۔ ان کی شان و شوکت

کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۴۰/۸۲) لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستے پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۰/۸۳) لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر فرحاں و نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغامبرانِ انقلابِ آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے، اس سے ہمارے ہاں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو ان سے وہ آسمانی پیغام رساں کہتے تھے۔ انہیں ان تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (۴۰/۸۴) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو کہا کہ ہم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور جس نظام کو اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے اسے مسترد کرتے ہیں۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ لیکن جب تباہی سامنے آکھڑی ہو تو اس وقت غلط روش سے اجتناب کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ پھر اس قوم کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ کوئی وقتی بات نہ تھی جو صرف کسی ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی۔ سُنَّتَ اللّٰهِ

یہ سنت اللہ ہے

الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ (۴۰/۸۵) یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری و ساری رہی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) اور تو خدا کی اس روش، اس قانونِ محکم میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضمناً یہ بیان فرما دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں ایک اور گوشہ سے بھی تاریخ کی

اشتراکیت کا نظریۂ تاریخ

اہمیت کو بڑی بلند کی گئی ہے اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ اس کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ کی تفصیل طول طویل ہے لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کا بھی وہی حشر ہوتا ہے، جو اس سے سابق نظام کا ہوا تھا۔ انسان کی ساری تاریخ انہی تضادات کی باہمی کشمکش کی داستان ہے۔ جسے جدلیت (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے۔ تضادات کی یہ کشمکش اس قدر پُرقوت اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ایسی قوت ہے جو اس تمام عمل اور سلسلۂ واقعہ ہوتی ہے، تو اس نے کہا کہ اس قوت کا نام تاریخی دباؤ (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔ یہ اصطلاح ایسی مبہم بلکہ موہوم ہے کہ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ وہ شے ہے کیا جسے

اس قدر مہیب اور لافانی قوت حاصل ہے کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی کوئی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ نہ دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مارکس نے خدا اور اس کے قوانین کا انکار کیا تو اس سے اس کے تحت الشعور میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن ۔۔ خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں ۔۔ اس لئے اسے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کسی قوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اس کے لئے اس نے "تاریخی وجوب" کی ایک موہوم سی اصطلاح وضع کر لی اور اس طرح اپنے لاشعوری خلا کو پُر کر لیا۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجاتی ہے گی کہ کاروانِ انسانیت جن راستوں سے گزرا ہے، تاریخ ان کے ریکارڈ کا نام ہے اور بس۔ اس ریکارڈ کو کون سی قوت حاصل ہو سکتی ہے! یہ ریکارڈ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ فلاں دور میں کس قسم کے ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے اور فلاں زمانے میں کس قسم کا معاشی نظام رائج کیا گیا اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ تاریخ بہرحال انسانی سعی و کاوش اور فکر و عمل کا ریکارڈ ہے اور ریکارڈ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔

اشتراکیت میں تاریخ کا ایک اور تصور ہے جو اس سے بھی کہیں زیادہ گمراہ کن ہے۔ اسے کہتے ہیں تاریخ کی مادی تعبیر (THE MATERIALIST CONCEPT OF HISTORY) اس تصور کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں ان کا جذبۂ محرک محض معاشی (یعنی مادی مفاد کا تصادم) تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات سب واہمہ ہیں۔ انگلز (ENGELS) اس باب میں لکھتا ہے:

> تاریخ کے مادی تصور کی بنیاد اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے ..... اس تصور کی رو سے ہر تبدیلی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل۔ اس کے بنیادی اور اصلی سبب کو لوگوں کے دلوں کے اندر یا خارجی حق و صداقت اور عدل و انصاف کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظِ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (یا نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ (ANTI DUHRING - P. 300)

جہاں تک آئیڈیالوجی (یا نظریۂ حیات) کا تعلق ہے، انگلز لکھتا ہے کہ:

> (اس میں شبہ نہیں کہ) آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (FALSE CONSCIOUSNESS) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا عمل مبنی بر نظریہ کہلا ہی نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے

(MARX - ENGELS CORRESPONDENCE, P. 510-511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی لڑائیاں یا تصادمات کہتے ہیں، وہ درحقیقت حق اور باطل کی لڑائیاں نہیں تھیں، وہ درحقیقت معاشی لڑائیاں تھیں۔ حق کی خاطر لڑنے والے مصلحین جیسے کہ حضرات انبیاء کرام (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا تھے جو

اسے حق و باطل کا تصادم سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

یہ ہے اشتراکیت کا سب سے اہم نظریۂ تاریخ۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کا نظریۂ تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ مختلف نظریاتِ حیات کی کشمکش کا ریکارڈ ہے۔ جو نظریہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ان کے خلاف ہوتا ہے وہ شکست کھا جاتا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت قانون میں ہوتی ہے۔ قانون کی سرگزشت میں نہیں ۔ اقوامِ سابقہ کی ان سرگزشتوں کو بھی قرآن نے داستان گوئی کے لئے بیان نہیں کیا۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے (یعنی ہر زمانے کی اقوام سے) یہ کہتا ہے کہ ان اقوامِ سابقہ کے انجام و عواقب کو سامنے رکھ کر تم اپنے لئے آپ فیصلہ کر لو۔ جس قوم جیسی روش تم اختیار کرو گے اسی قوم جیسا انجام تمہارا ہو جائے گا۔

قرآن کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم (حضرت) نوحؑ سے کیا ہے اور مختلف اقوام کی سرگزشتیں بیان کرتا عہدِ نبی اکرمؐ تک پہنچ گیا ہے۔ میں آج کی نشست میں یہ واضح کرونگا کہ قرآن کریم نے وہ کون سے جرائم (یعنی غلط نظام) بتائے ہیں جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں کہ کیا ہم بھی قومی حیثیت سے انہی جرائم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

تمہیدی وضاحت

اس سلسلہ میں دو اہم امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ غلط روش پر چلنے والی قوم میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن قرآن کریم ان تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس میں وہ صرف اس بنیادی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر کرتا ہے جو اس نظام کی اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی خرابیاں اس کے برگ و بار ہوتی ہیں۔ خدا کا رسول بھی سب سے زیادہ زور اسی بنیادی خرابی کے ازالہ پر دیتا اور اسی کو اُن کی تباہی کا موجب قرار دیتا ہے۔ ان اقوام کی سرگزشت کے بعد جب ان بنیادی جرائم کی فہرست ہمارے سامنے آئے گی تو یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہو جائے گی کہ قومیں کس قسم کے جرائم یا غلط نظریاتِ زندگی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ اصل چیز نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ جرائم درحقیقت غلط نظریہ یا تخریبی نظام کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اور یہیں سے وہ دوسری بات ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر کرنا میں نے ضروری قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ تباہ ہونے والی قوم میں یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں خوبیاں یا اچھائیاں ہوں۔ اس میں اچھے افراد بھی ہوتے ہیں لیکن غلط اجتماعی نظام کے تباہ کن نتائج کو ان کی انفرادی نیکیاں روک نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸/۲۵) اس فتنے سے بچتے رہو جو جب آتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم و جرائم کئے ہوں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند کو احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آجاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس تغافل یا تساہل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دیا کرتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے حال نظام کس قسم کا رائج کرتی ہے۔ غلط نظام میں بسنے والے وہ افراد بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے جنہوں نے انفرادی طور پر کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اس سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اس نظام کو مسترد کر کے یا تو اس

کی جگہ صحیح نظام قائم کریں؛ یا ان لوگوں سے الگ ہو کر کسی ایسی جگہ چلے جائیں جو صحیح نظام کے قیام کے لئے سازگار ہو۔ اسے دین کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے جو قریب قریب ہر رسول کا شیوہ رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان اہم اقوام کی سرگزشتوں کی طرف آتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

قوم حضرت نوحؑ

قرآن کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کے سلسلہ کا آغاز قوم نوح سے کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس لئے وہ ان اقوام کے زمان و مکان کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مقصدِ پیشِ نظر تک محدود رکھتا ہے یعنی اس حقیقت تک کہ اس قوم نے اپنے ہاں معاشرہ کس قسم کا قائم کر رکھا تھا۔ اس معاشرہ کی نمایاں خرابیاں کیا تھیں، اور ان کا انجام کیا ہوا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کے احوال و کوائف سے اس کی اولین مخاطب (عرب) قوم اچھی طرح واقف تھی۔ اور ایسے کرنا بھی ہی چاہیئے تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ دیکھو! پاتالین قوم نے یہ کیا اور اس کا انجام یہ ہوا، تو قوم مخاطب سب سے پہلے یہ سوال لے اٹھتی کہ پاتالین قوم کون تھی، کہاں تھی، ان کی تباہی کیسے ہوئی اور کیا معلوم یہ کچھ ہوا بھی یا نہیں۔ یہ سلسلہ بحث و تحقیق شروع ہو جاتا اور اصل مقصد اسی الجھاؤ میں کھو جاتا۔ وہ جن اقوام کا ذکر کرتا ہے ان کی داستانیں قوم مخاطب (عربوں) کے ہاں عام تھیں اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات، ان کے گرد و پیش اور ان کی سیاحت کے راستوں میں بکھرے پڑے تھے۔ یعنی وہ اقوام جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰکِنِہِمْ (۲۰/۱۲۸)، جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ ان اقوام کی سرگزشتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے فقط اتنا بتایا کہ ان کا یہ انجام کیوں ہوا اور اگر تم بھی وہی کچھ کرو گے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

آغازِ داستانِ قومِ نوحؑ

ہاں ذہن میں یہ رہنا چاہئے کہ قرآن کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم نوح کی سرگزشت سے کیا ہے۔ تاریخی قیاسات کا رُخ اس طرف ہے کہ یہ قوم دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بستی تھی اور ان کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار قبل مسیح کا تھا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ وہ قوم زمانہ قبل از تاریخ کی دیگر اقوام اور قبائل کی طرح بت پرست تھی۔ ہنوز تمدن کی اس سطح پر بھی نہیں پہنچی تھی جہاں اتنا بھی معلوم ہو کہ سیلاب کی تباہی سے بچنے کے لئے کشتی بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی بتائی تھی۔ اور جب وہ لوگ انہیں کشتی بناتے دیکھتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو رسوم و رواج اور زندگی کے طور طریق انہیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملے تھے، انہیں بے حد مقدس سمجھتے اور ان پر شدت سے کاربند رہتے تھے۔ وہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی دلائل و براہین پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس قوم کی علمی، ذہنی

طبقاتی امتیازات

اور تمدنی سطح تو یہ تھی، لیکن معاشرہ میں طبقاتی امتیازات بڑی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور یہی اس معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی تھی جسے قرآن نے نمایاں طور پر بیان

کیا ہے، اور جس کے نتیجہ میں وہ قوم تباہ ہو گئی۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) تمام انسان بنیادی طور پر یکساں واجب التکریم ہیں۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین جوہر ذاتی اور حسن سیرت و کردار کی رو سے ہوگا، نہ کہ حسب نسب، پیشہ یا دولت کے معیار کے مطابق۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا اور جس کی مخالفت، اور سخت مخالفت، اکابرین قوم کی طرف سے ہوئی۔

اس مقام پر ایک اور بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ہر رسول کے سلسلہ میں کہا ہے کہ

مخالفت ملاء قوم کیطرف سے

جس کے انقلابی پیغام کی مخالفت سب سے پہلے، ملاء قوم نے کی۔ اس میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے الفاظ اس تکرار و اصرار سے آئے ہیں کہ ایک پارہ (نویں پارہ) کا عنوان ہی قَالَ الْمَلَاُ بن گیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "سرداران قوم"۔ عرفی اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کے بدن ضروریات زندگی کے سامان سے ہر وقت بھرے رہیں۔ یعنی قوم کا دولت مند خوشحال طبقہ۔ انہی کو قرآن نے دیگر مقامات پر مترفین کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں جنہیں زندگی کی آسائشیں بافراط حاصل ہوں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی، قوم کے دولتمند سرمایہ پرست طبقہ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی، اور ان کی تائید و حمایت مذہبی پیشوائیت کیطرف سے ہوئی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ جو غلط نظریات اور مسالک تمہارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں ان کی جگہ قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کرو، تو فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ۔ تو اس قوم کے اکابرین نے جن کے ہاں دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے صحیح مسلک زندگی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی اس سے کہا کہ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱/۲۷) تم ہمیں کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے نہایت پست درجہ کے، کمینے اور رذیل لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ انہیں عقل ہے نہ فکر، اس لئے وہ بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں اور تم اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہو کہ تمہاری دعوت حق و صداقت پر مبنی، اور تمہاری پکار بڑی جاذب ہے۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے (۱۱/۲۹) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷) ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو ہمارے مقابلہ میں کونسی فضیلت حاصل ہے جو ہم اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے سوچو اور سمجھو۔ اسے دیکھو اور پرکھو کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ یہ دیکھو کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے ان کا پیشہ کیا ہے وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۶/۱۱۲) میری نگاہ ان کی سیرت و کردار پر ہے۔ اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ جس معاشرہ کی تشکیل کی میں دعوت دیتا ہوں اس میں معیار تکریم و تعظیم کردار کی بلندی اور جوہر ذاتی کی گرانمایگی ہوتا ہے، نہ کہ حسب و نسب کی تفریق اور ذاتوں اور پیشوں کی تمیز۔ حسب و نسب کی تفریق انسانی انانیت کا خود ساختہ امتیاز ہے۔ اور پیشوں کا فرق معاشرہ میں تقسیم کار کا نظری نتیجہ۔ لہٰذا ان امور کو شرف انسانیت سے کیا واسطہ؟ اگر ایک محنت کش مزدور، کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ہے تو وہ اس صاحب ثروت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا کردار پست ہے۔

اس پر ان اکابرینِ قوم نے کہا يٰنُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا (۱۱/۳۲) اے نوحؑ! ہم نے دیکھ لیا کہ تم بہت جھگڑالو واقعہ ہوئے ہو۔ تم نے بہت لمبی چوڑی باتیں کر لیں اور ہم نے سن لیں۔ اس بحث و تمحیص سے کچھ حاصل نہیں۔ ایک فیصلہ کن بات سن لو۔ وہ یہ کہ ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اس کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ قوم کے اشراف و اجلاف، رؤسا و زیاں، اور سرمایہ دار اور محنت کش، ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں؟ اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے ان متکبرین سے کہا کہ تمہارا مطالبہ یکسر باطل اور بیہودہ ہے۔ دعوتِ خداوندی کی رُو سے انسانوں کی وجہِ جامعیت واخوت ایمان ہے وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶/۱۱۴) میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو جو اس کی دعوت کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں دھتکار نہیں سکتا۔ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ (۱۱/۳۰) اگر میں انہیں دھتکار دوں تو تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے لیکن یہ بتاؤ کہ اس جرمِ عظیم کی پاداش سے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مجھے ملے گی، مجھے کون بچا سکے گا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (۱۱/۳۱)۔ تو میں بھی انہی لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو غریبوں اور مفلسوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ! تم اگر اس کے لئے آمادہ نہیں ہو تو اسے اچھی طرح سن رکھو کہ ہم تمہاری ان حرکتوں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ان ادنیٰ اور رذیل لوگوں کو سر پر چڑھا کر طبقاتی امتیازات کو مٹانے کا خیال خام کر رہے ہو۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ ..... لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (۲۶/۱۱۶) اگر تم اس فتنہ پردازی سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے خلاف پراپیگنڈا کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں مذہبی پیشوائیت ان کا موثر ترین آلۂ کار تھی۔ یہ مخالفت تو وہ تھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت ہر فتنہ کو مذہب کا رنگ دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈگڈگی بجانی شروع کر دی کہ تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (۱۴/۱۰) لوگو! دیکھو۔ یہ نیا فتنہ اٹھا ہے۔ یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے منحرف کرانا چاہتا ہے۔ یہ ان معبودوں کی مخالفت کرتا ہے جنہیں تمہارے آباء و اجداد پوجتے چلے آئے ہیں! امیر اور غریب کا فرق خدا کا پیدا کردہ ہے۔ معزز اور ذلیل کی تفریق پیدائشی ہے۔ یہ ان امتیازات کو مٹا کر مساوات کی غیر فطری دعوت دیتا ہے۔ یہ کفر ہے، یہ الحاد ہے۔ یہ بالکل انوکھی بات ہے۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۲۳/۲۴) ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ تم اٹھو اور اس فتنہ کا سر کچل کر رکھ دو۔

یہ تھا وہ مقام جہاں حضرت نوحؑ نے (قرآن کے الفاظ میں) اپنے رب کو پکارا اور کہا تھا کہ اس قوم کے سعادتمند افراد نے حق و صداقت کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے باقیماندہ افراد میں اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا انہیں تباہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل بڑی وقیع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر معاشرہ کی یہ خرابی انہی موجودہ افراد تک محدود ہوتی تو اسے برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو نسل ان سے آگے چلے گی وہ بھی انہی نظریات کی حامل اور اسی انداز معاشرت کی علمبردار ہوگی۔ اس طرح یہ وجہِ تفریقِ انسانیت انداز معاشرہ نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھتا چلا جائے گا اور یہ روش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس لئے رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا (۷۱/۲۶) بار الٰہا! ان لوگوں کا

نام و نشان تک مٹا دے۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۷۱/۲۷)۔ اگر ان لوگوں کو علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ وہ سرکش لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور ان کی آنے والی نسل بھی، جو انہی کی گود میں پروان چڑھے گی، انہی نظریات کی حامل ہوگی۔

معیارِ قومیت

یہ تھا وہ جرمِ عظیم جس کی پاداش میں وہ قوم تباہ ہو گئی۔ ان تباہ ہونے والوں میں خود حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن ایک اور نکتہ کو سامنے لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ قومِ سرکش تو غرق ہو جائے گی لیکن میں "تیرے اہل" (یعنی تیرے اپنوں) کو بچا لوں گا۔ جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ ان کا بیٹا بھی غرق ہونے والوں کے زمرے میں شامل ہے تو انہوں نے کہا کہ بارالٰہا! تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو میرے اہل کو بچا لیگا۔ تو بیٹے سے بڑھ کر اپنا کون ہو سکتا ہے۔ اسے کیوں نہیں بچایا جاتا! اس پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے جواب ملا کہ اے نوح! یہ تیری بھول ہے جو تو اس لڑکے کو محض اس بنا پر کہ اس کے ساتھ تیرا خون کا رشتہ ہے، اپنے اہل میں سے سمجھتا ہے۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ یہ بیگانہ نہیں بیگانہ ہے اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶)۔ اس کے اعمال و کردار معیارِ خداوندی کے مطابق نہیں۔

یہاں قرآن نے "اپنے اور بیگانے" کا ایسا بنیادی اصول بیان کر دیا ہے، جو اسلامی نظریۂ قومیت کی اساس قرار پا گیا۔ یعنی (حضرت) نوح کا بیٹا، خون، رنگ، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود، اپنوں میں سے قرار نہ پایا۔ اپنوں میں سے وہی سمجھے گئے جو ایمان کے رشتے میں مشترک تھے۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی بھی چونکہ ایمان میں شریک نہ تھی، اس لئے وہ بھی غیر قرار دے دی گئی۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے اپنے بلند، عالمگیر، غیر متبدل اصولوں کی صداقت کے لئے جس قوم کی سرگزشت سے آغازِ داستان کیا، اس میں بتایا یہ گیا ہے:

(۱) جس قوم میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہوں، جہاں اشراف اور رذائل کی تفریق پیدائش کی رو سے کی جائے، جس میں عزت کا معیار دولت ہو، جس میں عام پیشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے، جس میں رؤسا اسے برداشت نہ کر سکیں کہ مفلس اور غریب ان کے برابر بیٹھ جائیں۔

(۲) جس قوم کا مسلک یہ ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے، اس پر غور و فکر کرنا کفر و الحاد ہے، اور

(۳) جس قوم میں معیارِ قومیت، رنگ، نسل، خون، وطن، زبان کا اشتراک ہو، نہ کہ ایمان کا رشتہ۔

وہ قوم آخر الامر تباہ ہو کر رہتی ہے۔ اب آگے بڑھیئے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اور اہم بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ایک رسول جس قوم کی طرف آتا تھا اس میں ہر قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں، لیکن ان میں ایک خرابی اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اس رسول کا مقصد صرف اس ایک خرابی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس معاشرہ کو تمام خرابیوں سے پاک اور صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی خارجی علاج جوئیر، یا میکانکی طریق کار اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ اس قوم کو اصولی تعلیم دیتا تھا جس سے ان کا اندازِ نگاہ بدل جائے اور اس طرح ان کا معاشرہ ان خرابیوں سے منزہ ہو جائے۔ یہ اصولی تعلیم کیا تھی: قرآن نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر رسول اپنی قوم کو یہی دعوت دیتا تھا۔ وہ دعوت کیا تھی:

يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللهَ (۷/۵۹) اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت، محکومی، فرماں پذیری اختیار کرو۔ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللهَ (۱۱/۲۶) اس کے سوا کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت نہ کرو۔ یہ تھا ان کی ساری خرابیوں کا علاج' مع اس بنیادی خرابی کے جس کی طرف وہ ان کی توجہ خاص طور پر مبذول کراتا تھا۔ یاد رکھئیے۔ قرآن کریم چیچک کا علاج ہر آبلہ پر پھایا رکھنے سے نہیں کرتا۔ اس سے مرض کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علاماتِ مرض کے بجائے علتِ مرض کا ازالہ کرتا ہے' اور جب علت کا ازالہ ہو جاتا ہے تو علامات خود بخود مفقود ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، تمدنی، حتیٰ کہ انفرادی' خرابیاں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ وہ برگ و بار ہوتی ہیں غلط نظامِ زندگی کا۔ لہٰذا' ان کا علاج بھی الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ اس غلط نظام کی جگہ صحیح نظام (جو وحیِ خداوندی پر مبنی ہو) نافذ کر دینے سے ہو سکتا ہے۔ یہی خدا کا تجویز کردہ علاج ہے اور یہی آسمانی انقلاب لانے والے حضرات انبیاء کرام کا طریق کار تھا۔ اسی طریق کو اسلامی کہا جاتا ہے۔

بہرحال' ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کے ابدی اصول کے مطابق' طبقاتی تفریق معاشرہ کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ ضمناً' قرآن نے تاریخی سرگزشتوں کے سلسلہ کی ابتدا اس سے کی ہے' اور (یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ) اس سلسلہ کی آخری کڑی میں بھی اسے دہرایا گیا ہے' یعنی حضور نبی اکرمؐ کی قوم (قریش) کے سرداروں نے بھی بعینہٖ یہی اعتراض کیا اور انہیں بھی بعینہٖ یہی جواب دیا گیا (تفصیل کے لئے دیکھئے ۶/۵۲)۔ لیکن یہاں قرآن نے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ بتایا کہ اس امتیاز سے تباہی کیوں آتی ہے۔ فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ (۶/۵۳) یعنی یہ طبقات ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے فتنہ اور مصیبت کا موجب بنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن تک یہ بات تو ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی کہ بالادست طبقہ کس طرح زیر دست طبقہ کے لئے مصیبتوں کا موجب ہوتا ہے۔ وہ ان پر کیسے کیسے ظلم و ستم کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی تھی کہ زیر دست طبقہ بھی بالادست طبقہ کے لئے فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ بات' اس زمانہ میں سامنے آئی ہے اور اب لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ طبقاتی امتیاز نہ صرف زیر دست طبقہ کے لئے باعثِ مصیبت ہے بلکہ یہ خود بالادست طبقہ کیلئے بھی فتنہ کا موجب ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔

یہ تھی داستانِ قومِ نوح۔ اب آگے بڑھیئے۔

قومِ عاد

قومِ نوحؑ کے بعد قرآن کریم' قومِ عاد کی سرگزشت سامنے لاتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف یمن سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام تک حکمران تھی۔ قریب دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس قوم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے جس سے وہ (یوں سمجھئے گویا) موجودہ زمانے کی مغربی اقوام کے مماثل نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ قوت و حشمت اور مرفہ الحالی اور فارغ البالی

میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام پر سرفراز تھی۔ قرآن کریم نے زَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْطَۃً (7/69) کہہ کر ان کی مادی وسعتوں اور توانائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وَلَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ (89/8) کے اضافے سے یہ بتایا ہے کہ اس کی ہمعصر اقوام میں کوئی اس کے ہمسر نہیں تھا۔ انہیں اَنعام و بنین اور جنّات و عیون کی بخششیں بافراط حاصل تھیں (26/132-134) یعنی مال مویشی کی بھی کثرت، اور یہ جتھہ بھی بہت وسیع۔ لہلہاتے باغات اور سرسبز و شاداب کھیتیاں بھی بکثرت اور چشموں کا آب مصفا بھی رواں دواں۔ یہی اس زمانے کی دولت اور قوت تھی جو اس قوم کو اس فراوانی سے حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَۃً (46/26) انہیں سمع و بصر کی قوتیں بھی حاصل تھیں اور قلب و دماغ کی صلاحیتیں بھی۔ یعنی اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق، اشیائے فطرت کو مسخر کرنے اور ان سے مفید مطلب نتائج اخذ کرنے کی صلاحیتیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَکَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ (29/38) وہ جاہل اور بے بصر قوم نہیں تھی۔ دانا و بینا تھی۔ علم و ہنر سے بہرہ یاب تھی۔ ان کی تمدنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ (26/129) وہ ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ حکومت کرنی ہے۔ یہاں تک کہ اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ (26/128) وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں تعمیر کرتی تھی۔ مٹنا یہاں قرآن کریم نے ایک لفظ کے اضافہ سے ان کی یادگاروں پر ایسی گہری تنقید کی ہے جس کی زد انہی کی یادگاروں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آتی ہے جس کا اطلاق ہر زمانے اور ہر قوم کی یادگاروں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ وہ ایسی یادگاریں بنانے تھے جن کا افادی پہلو کوئی نہیں تھا۔ اس سے محض ان کی انانیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً بڑے بڑے اونچے مینار یا محکم سنگین اور فولادی چٹانیں، جن پر صرف تو اتنا زیادہ ہو لیکن قوم یا انسانیت کو اُن سے فائدہ کچھ نہ پہنچے۔ یعنی محض خود نمائی کی خاطر عبث و بیکار اسراف!

قرآن کریم نے اس قوم کے جرائم کی تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن اس نے جو کچھ اجمالاً کہا ہے اس میں ساری تفاصیل سمٹ کر آ گئی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ قوم المجرمین تھی۔ عربی زبان میں جرم کہتے ہیں کسی کے درخت کا پھل کاٹ اور توڑ کر اپنے ہاں لے آنا۔ بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ آپ دیکھئے کہ اس ایک لفظ میں اس قوم کے نظام کا پورے کا پورا نقشہ کس طرح نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں سلب و نہب، استحصال (EXPLOITATION) و استعمار معمول ہو۔ جس میں دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہر ممکن حربہ سے لوٹ لیا جائے۔ جس میں کیفیت یہ ہو کہ

قوم المجرمین

آنکہ بر اسنے دیگر چید   دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

محنت کوئی کرے، اس کا ماحصل کوئی اور لے جائے اور وہ بھی اس طرح کہ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (26/130) وہ کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ ان کی گرفت اس قدر محکم ہوتی تھی کہ کوئی اس سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے حکمران جَبَّارٍ عَنِیْدٍ تھے، یعنی بڑے ظالم اور جابر۔ بڑے سرکش اور متکبر۔ دوسری جگہ ہے۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً (41/15) انہوں نے ناحق ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی اور نخوت اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ

وہ دھڑلے سے کہتے تھے کہ ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جو اس کی جرأت کرے ہم اس کی آنکھ نکال دیں گے۔ ہماری قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جو ہمارے راستے میں آئے گا ہم اسے کچل کر رکھ دیں گے۔

یہی وہ قوم جس کے ہاتھوں مظلوم و مقہور انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ جب ان کے مظالم انتہا تک

حضرت ہودؑ

پہنچ گئے تو ان کیطرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تاکہ انہیں اس روش سے باز رکھا جائے۔ انہوں نے آکر ان سے کہا کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اسے چھوڑ کر قوانین خداوندی کا اتباع کرو۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ (۷/۶۶) اس قوم کے اکابرین نے کہا ــــ دیکھئے یہاں بھی وہی لفظ اَلْمَلَاُ آیا ہے ــــ یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست بھرپور حاصل تھا۔ ــــ انہوں نے نشۂ قوت میں بدمست ہو کر کہا کہ میاں! (معاذ اللہ) ہوش کے ناخن لو۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ نظام جس کا نتیجہ دولت و حشمت اور قوت و شوکت کی اس قدر فراوانیاں ہیں، کبھی تباہی اور بربادی کیطرف نہیں لے جا سکتا۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ۔ ان پر جذبات اس قدر غالب آچکے تھے کہ انہیں کوئی شے اپنے اصلی رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ انہیں اپنا سیاہ نامۂ اعمال بھی نہایت درخشندہ اور مزین نظر آتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب ذہنیت ایسی ہو جائے تو پھر کسی ناصح کی نصیحت کو کون سنتا ہے۔ انہوں نے حضرت ہودؑ کی نصیحت و موعظت سے اعراض برتا۔ تکذیب کی سرکشی پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ تباہی تھا۔ اس تباہی کا نقشہ قرآن کریم نے بڑے عبرت انگیز انداز میں کھینچا ہے۔ کہا کہ اے قوم مخاطب! تم جو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر اترا رہے ہو، گوشِ ہوش سے سنو کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ۔ ہم نے انہیں ایسا تمکن و تسلط عطا کیا تھا، وہ قوت و سطوت بخشی تھی، جو تمہیں بھی حاصل نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ لوگ جاہل تھے اس لئے اپنی جہالت کیوجہ سے تباہ ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً۔ انہیں دیکھنے سننے کی صلاحیت اور سمجھنے سوچنے کی اہلیت عطا کی تھی۔ وہ دیدہ ور اور باشعور تھے۔ صاحب علم و ہنر تھے لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، مستقل اندارِ سماوی سے اعراض برتا، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کیا تو ان کا علم و ہنر ان کے کسی کام نہ آیا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سب بیکار ثابت ہوئیں وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہلاک ہو گئے۔ انہیں ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے کوئی چیز نہ بچا سکی۔ اور یہ بات کچھ انہی سے مخصوص نہیں وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۷/۱۷۴)۔ ہر مجرم قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ان کی ہنرمندیاں انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

تدبّر کی فسوں سازی سے محکم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

قوم عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کی رُو سے، وہ نظامِ زندگی جس میں دوسروں کی محنت کو لوٹا کھسوٹا جائے جس میں کمزوروں اور ناتوانوں کو ہدفِ جور و ستم بنایا جائے جس میں

سلب و نہب اور (EXPLOITATION) قوم غالب کا شعار ہو، وہ نظام کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ نظام بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی حامل قوم بھی تباہ و برباد۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے، یہ اس کا اٹل فیصلہ ہے۔

اب آگے چلیے۔

قومِ ثمود

قدیم زمانے میں، حجاز سے جو شاہراہ شام کو جاتی تھی، اس پر وادی قریٰ میں، ایک نامور قوم آباد تھی جو تاریخ میں ثمود کے نام سے متعارف ہے۔ زمانہ ان کا قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال (ق۔م) کا بتایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق، اس قوم کو بھی بڑا تمکن حاصل تھا۔ (۷/۷۴) پُر فضا باغات، لہلہاتی کھیتیاں، صاف اور شفاف پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے، وہ میدانوں میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں میں محکم قلعے بناتے (۷/۷۴ ، ۱۵/۸۲ ، ۲۶/۱۴۹)۔ قرآن کریم نے ان کا بنیادی جرم، اور ان کے نظام کی اساسی خرابی وہ بتائی ہے جسے خود ہمارے زمانے میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار گلہ بانی پر تھا۔ وہ مویشی پالتے اور ریوڑ چراتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گلہ بانی کے لئے وسیع و عریض چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی ضرورت لاینفک ہے۔ اور یہ کچھ انہیں فراوانی سے حاصل تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ اس کے باوجود یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۲۶/۱۵۲) ملک میں فساد برپا کرتے تھے۔ اس فساد کی تفصیل غور طلب ہے۔ سرداران قوم ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنی ذاتی ملکیت جتا کر

معیشت۔ گلہ بانی

انہیں اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور کمزور اور غریب لوگوں کے جانور بھوکے پیاسے رہتے...... ان کی طرف حضرت صالحؑ خدا کا یہ انقلابی پیغام لے کر آئے۔ کہ یہ چراگاہیں اور چشمے، ربوبیت عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مفت ملتے ہیں۔ اس لئے انہیں تمام ضرورت مندوں کی لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر دوسرے انسانوں اور ان کے مویشیوں کو رزق سے محروم کر دے۔ ظاہر ہے کہ اکابرینِ قوم اس انقلابی دعوت کو کیسے قبول کر لیتے؛ چنانچہ جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا ہے، مظلوم اور نادار طبقے نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور سردارانِ قوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ۔ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّہٖ (۷/۷۵) تکبر و نخوت کے نشے میں مدہوش سردارانِ قوم، ان لوگوں سے پوچھتے تھے جنہیں انہوں نے جبر کمزور اور ناتواں بنا رکھا تھا اور جو حضرت صالحؑ کیساتھ ہو گئے تھے، وہ ان سے پوچھتے تھے کہ کیا تم واقعی دل سے یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا پیغامبر ہے۔ وہ یقیناً جواب میں کہتے کہ ہم اسی لئے اس کے ساتھ ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کا پیغام ہے، ورنہ یہ بھی تو تم ہی میں سے ایک تھا۔ یہ اس قسم کی دعوت لے کر کیوں اٹھتا۔ اِدھر سے ہٹ کر وہ خود صالحؑ سے مخاطب ہوتے اور کہتے کہ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ۔ (۲۶/۱۵۳) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ کوئی صاحب عقل و ہوش یہ کہہ سکتا ہے کہ ان زمینوں پر ہمارے حقوق مالکانہ سب ناجائز

ہیں۔ اور ان ناداروں کو جو اپنی روٹی تک کے لئے ہمارے محتاج ہیں' ان پر اسی طرح تصرف کا حق حاصل ہے جیسا ہمیں! اس سے تو معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ ہم اس کی کبھی اجازت نہیں دینگے۔ وہ اُن سے کہتے کہ یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (۱۱/۶۲) تُو تو ہم میں سے بڑا عقلمند آدمی تھا۔ قبیلہ کا ممتاز رکن تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قبیلہ کی دولت وحشمت کو برباد کر دینے کی سوچ رہے ہو! لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغامبرِ انقلاب پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی دعوت پر جمے رہے۔ اور دوسری طرف سے مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ اس مقام پر قرآن کریم نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے دیکھا کہ اس معاشرہ میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں' اور بات دو چار دس کی نہیں، یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے' تو سوچا کہ انکی اصلاح کس طرح ممکن ہو گی! — سینہ تمام داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم — اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ بے شک قوم میں یہ خرابیاں عام ہیں، لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وَكَانَ

قوم کے سرغنے فساد کی جڑ ہوتے ہیں

فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ـ (۲۷/۴۸) مملکت کے مرکزی مقام میں صرف نو سرغنے (لیڈر) ہیں جو اس سارے فساد کی جڑ ہیں۔ وہی قوم کو صحیح راستے کیطرف نہیں آنے دیتے۔ ان کا بندوبست کر لو تو سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ کرام! کہ قرآن دو لفظوں میں کتنی عظیم حقیقت کو بے نقاب کر گیا ہے۔ عوام نہیں بگڑتے، یہ چند خواص ہوتے ہیں' جو اپنے مفاد کی خاطر ان میں بگاڑ پیدا کرتے اور انہیں فساد پر اُکساتے رہتے ہیں۔

بہر حال' مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ ان نو سرغنوں نے تہیہ کر لیا کہ حضرت صالحؑ کے مکان پر دھاوا بول کر انہیں اور ان کے اہل کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے وارثوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلا دیا جائے کہ ہمیں اس قتل کا کوئی علم نہیں۔ (۲۷/۴۹) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ سازش بھی ناکام رہ گئی اور حضرت صالحؑ نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ وہ ان کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اب دیکھئے کہ اس مصالحت کی شرط کیا تھی۔

آپ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ یہ مویشی ہمارے ہیں اور یہ زمینیں بھی ہماری ہیں' اس لئے ہمارے مویشی ہماری زمینوں میں ہی چُگتے چرتے ہیں۔ اس کے مقابل میں وہ اُن لوگوں کے مویشی ہیں جن کی یہ زمینیں نہیں۔ اس لئے وہ ان زمینوں میں نہیں آسکتے۔ یہ تمہاری بھول ہے اور اس کی بنیاد اس غلط نگہی پر ہے کہ تم نے جانوروں اور زمینوں کی نسبت انسانوں کیطرف کر رکھی ہے۔ اس لئے "میری اور تیری" کے پھیر میں پڑ گئے ہو۔ درحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ یہ جانور سب خدا کی مخلوق ہیں — تمہارے بھی اور ان دوسرے لوگوں کے بھی — اور زمین ساری خدا کی ہے جسے اس نے اپنی مخلوق کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے۔ لہٰذا چراگاہیں سب مویشیوں کے لئے کھلی رہنی چاہئیں۔

انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔ آپ نے کہا کہ بہت اچھا۔ لیکن یہ ایک عملی مسئلہ ہے اس لئے اس کا ثبوت بھی عملی ہونا چاہیئے۔ وہ عملی ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری۔ نہ زید کی ہے نہ عمر کی۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ زمینیں بھی اللہ کی ہیں۔ اگر تم نے اس اونٹنی کو آزاد چرنے چگنے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ کے پابند ہو۔ اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اس سے منحرف ہو گئے ہو۔

اس مقام پر، عزیزانِ من! میں قرآنِ کریم کے وہ چار الفاظ سامنے لانا چاہتا ہوں جو قرآنی نظامِ معیشت کا سنگِ بنیاد ہیں۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا۔

خدا کی زمین خدا کی مخلوق کیلئے

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ ..... (۷:۷۳)

یہ ناقۃ اللہ ہے اور وہ ارض اللہ۔ ناقۃ اللہ ارض اللہ میں چرے چُگے گی۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔ غور کیجئے، برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم نے ان چار الفاظ میں، اس اقتصادی مسئلہ کا حل کس جامعیت سے بیان کر دیا ہے جو تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ وجۂ نزاع و فساد رہا ہے اور اب تک ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ذرائع رزق پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انہیں تمام مخلوق کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ حضرت صالحؑ نے اپنے پیشِ نظر خاص واقعہ کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اسے عالمگیر اصول قرار دینے کی جہت سے فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

زمین بھی خدا کی اور بندے بھی خدا کے۔ اس لئے خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

سردارانِ قوم ثمود نے کرنے کو تو یہ معاہدہ کر لیا لیکن وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ وہ اور قوم کا غریب طبقہ ایک سطح پر آجائیں۔ وہ جوشِ غضب میں پاگلوں کی طرح اُٹھے اور اس اونٹنی کو جو ان کے معاہدہ کی ٹھوس نشانی تھی ہلاک کر دیا۔ اور اپنے اسی سابقہ نظام پر قائم ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے باطل نظام کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

تباہی

قرآنِ کریم نے اس تباہی کا نقشہ دو لفظوں میں اس طرح کھینچا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت کی ساری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا۔ خدا نے اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بنا پر، ان پر اس طرح روڈ رولر (ROAD - ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہو گئی[1]۔ اور اس کے بعد ہے۔ فَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (۹۱:۱۴-۱۵) خدا کا قانونِ مکافات جب ظالموں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو ان کا لحاظ نہیں کیا کرتا۔ قانون کی [illegible] کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ عواقب سے نہ ڈرے۔ عواقب سے ڈرنا مصلحت کوشی ہے اور مصلحت کوشی اور عدل ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ کی قوم مخاطب سے کہتا ہے۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا۔ یہ ان کے گھر تمہارے سامنے موجود ہیں۔ ویران، خالی، اُجڑے ہوئے۔ یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۲۷:۵۲) قوم ثمود کی اس سرگزشت میں، اربابِ علم و بصیرت کے لئے، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی روشن دلیل ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ

جو قوم خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق (زمین وغیرہ) کو انسانوں کی ذاتی ملکیت قرار دے دے، وہ کبھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتی۔ اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہوگا۔

---

[1] چونکہ معاشرہ میں ناہمواریاں زمین کی بنا پر پیدا کی گئی تھیں۔ اسلئے قرآن نے تباہی کا استعارہ بھی زمین ہی کی شکل میں بیان کیا ہے۔

حیاتِ آخرت سے انکار

اس سلسلہ میں قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا غلط نظام وہی قومیں اختیار اور رائج کرتی ہیں جن کا نظریہ حیات یہ ہو کہ اِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا - وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ - (۲۳/۳۷) زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت اور اعمالِ انسانی کا محاسبہ سب افسانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان کا نظریہ زندگی یہ ہو جائے تو پھر وہ کونسی چیز ہے جو اسے سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ اور غصب و استحصال سے روک سکے۔ نظامِ سرمایہ داری اس تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یہ تصورِ حیات اس نظام کا لازمی نتیجہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس نے جب ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور دوسری طرف حیاتِ آخرت سے انکار کیا تو علامہ اقبالؒ نے اسے وارننگ دی کہ یاد رکھو جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو وہ اس تصورِ حیات کے ساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کی بنیاد ہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ عمارت اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے ۔۔۔ جستۂ او را اساسِ محکمے

تم جو ایک عالمگیر نظام کی آرزو لے کر اٹھے ہو، کیا تم نے اس کے لئے کسی محکم بنیاد کو بھی تلاش کر لیا ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔ اور قوم مدین کی طرف آجایئے۔

(باقی آئندہ)

تباہیوں کا سیلاب اب بھی رُک سکتا ہے

اگر قوم کے نوجوانوں کو ذہن نشین کرا دیا جائے کہ :

(۱) پاکستان کی بنیاد کیا تھی؟ ---- (۲) بانیٔ پاکستان، اقبالؒ، اور معمارِ پاکستان قائداعظمؒ نے اس مملکت کا تصور کیا دیا تھا؟ ---- (۳) دو قومی نظریہ کیا ہے؟ ---- (۴) نظریۂ پاکستان نہ فیل ہوا ہے، نہ کبھی فیل ہو سکتا ہے ---- (۵) پاکستان اب بھی ایک قابلِ فخر مملکت بن سکتا ہے۔

یہ موضوع ہے پرویز صاحب کی کتاب

قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان

کا ---- جو ابھی ابھی شائع ہوئی ہے کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ایک نسخہ ہر اس گھر میں رہے جس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا کر چکے ہوں۔

آپ اپنی کاپی جلدی منگا لیجئے۔
ورنہ پہلا ایڈیشن ختم ہو جائے گا

قیمت :- دس روپے ۱۰/-

ضخامت ۳۲۸ صفحات ۔ بڑی تقطیع ۔ سفید کاغذ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

روئیداد

مرتبہ: غلام صابر (ایم۔اے)
رفیقِ ادارہ

طلوعِ اسلام کی ۱۴ سالانہ چودہویں کنونشن

منعقدہ ۲۰ر لغایت ۲۳ر اپریل ۱۹۷۲ء
جمعرات تا اتوار

طلوعِ اسلام کی چودہویں سالانہ کنونشن ۲۵ر لغایت ۲۸ر دسمبر کو منعقد ہونی تھی، اُس کے انعقاد کے جملہ انتظامات مکمل ہو چکے تھے کہ عین وقت پر جنگ کی وجہ سے ملک میں ہنگامی حالات پیدا ہوگئے اور اس بنا پر اُسے باصد دل نخواستہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے فوری بعد احباب کا تقاضا شروع ہوگیا تھا کہ کنونشن کو سال بھر کے لئے ملتوی نہ کیا جائے بلکہ اس کا انعقاد جلد از جلد عمل میں لایا جائے۔ بایں ہمہ اپریل کے شروع میں حالات روبہ اعتدال ہوئے تو فیصلہ کیا گیا کہ کنونشن ۲۰ر لغایت ۲۳ر اپریل — (جمعرات تا اتوار) منعقد کی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے فوری ضروری اقدامات شروع کر دیئے گئے۔ کنونشن کا مرکز تو حسبِ معمول ۲۵-بی گلبرگ تھا۔ پنڈال کے لئے ادارہ سے متصل وسیع میدان منتخب کیا گیا۔ بانیٔ تحریک پرویز صاحب کے قدیمی رفیق محترم شیخ سراج الحق صاحب نے حسبِ سابق اپنے مکان کا صحن اور ایک حصہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ادارہ کے دوسری طرف محترم شیخ محمد یونس صاحب نے اپنے وسیع و عریض مکان کی نچلی منزل کنونشن کے مہمانوں کے لئے پیش کر دی۔ اور یوں موسمی خرابی کی طرف سے بھی پورا سکون اور اطمینان ہوگیا۔ پروگرام کے مطابق مہمانوں کو جمعرات کی دوپہر کو پہنچنا چاہیئے تھا لیکن اُن کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کا یہ عالم تھا کہ — سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا — اُن کی آمد بدھ کے دن ہی سے شروع ہوگئی۔ اور جمعرات کی دوپہر تک پوری فضا رشکِ کہکشاں بن گئی۔ ہر مکانات میں مہمانوں کی چہل پہل سامنے نہایت وسیع و عریض اور حسین و سادہ پنڈال۔ پنڈال میں بڑے بڑے نہایت خوشخط بینرز آویزاں جن پر آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں نظامِ ربوبیت کے اصول اور مقاصد جلوہ پیرا۔ باہر نہایت وسیع دو رویہ سٹال میں بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے سرگرم کارکن اپنے سٹال کی تزئین و آرائش میں مصروفِ کار۔ ان کے ساتھ کراچی کی طاہرہ بیٹیاں اپنی مصنوعات کی نمائش کے سلسلے میں محوِ تزئین و آرائش۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قریب ایک بجے مندوبین کا پہلا خصوصی اجلاس شروع ہوا۔ کراچی بزم کے برقی پا نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب رونق افروزِ مسندِ صدارت ہوئے۔ تلاوتِ قرآن کریم کے بعد ناظم ادارہ محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے

حسبِ معمول پیامِ اقبالؒ کی تشدید جانفزا باعث گرمیٔ محفل ہوئی۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے جواں سال، جواں ہمت، جواں بخت نمائندہ پروفیسر خالد سلام صاحب نے میزبان کی حیثیت سے مہمانانِ گرامی کو خوش آمدید کہا۔ محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے ادارہ کی ڈیڑھ سالہ رپورٹ پیش کی۔ مختلف حضرات نے مجلس کو اپنے ابتدائی خیالات سے نوازا۔ یہ سب کچھ نہایت سکوت و سکون اور جذب و انہماک سے ہو رہا تھا۔ لیکن ایک چیز بالکل نمایاں تھی اور وہ یہ کہ سالِ گزشتہ یہ ملک جن روح فرسا حوادث سے دوچار ہوا۔ اس کے اثرات تمام شرکائے محفل کے قلب و دماغ پر مسلط تھے۔ اور اُن کے چہروں کی افسردگی اُس گہرے غم و الم کی غماز تھی جو اُن حوادث کا لازمی نتیجہ تھے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں منعقد شدہ کنونشن کا اختتام کن کیفیات کو لئے ہوئے ہوگا اور کیا اُمید کی کوئی کرن ایسی ہوگی جو مایوسیوں کی اِن گھٹا ٹوپ تاریکیوں کا سینہ چیر کر شمعِ قندیلِ راہرواں بن سکے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تاثرات تنہا میرے ہی نہیں تھے، دیگر ندمائے محفل بھی قریب قریب ایسے ہی اثرات کے ساتھ مجلس سے اُٹھے تاکہ ظہر کی نماز کے بعد تین بجے اُس کھلے اجلاس میں شرکت کے لئے آ سکیں جس سے مفکرِ قرآن نے خطاب کرنا تھا۔

(۰)

پہلا کھُلا اجلاس

بروز جمعرات
۳ بجے دوپہر

صدارت : محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب
تلاوت : محترم حافظ محمد یونس صاحب
کلامِ اقبالؒ : محترم مرزا محمد خلیل صاحب
سٹیج سیکرٹری : محترم پروفیسر خالد سلام صاحب

تین بجنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا کہ میں داخلِ پنڈال ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامعین کا ایک ہجوم نہ معلوم کب سے پنڈال میں فروکش ہو چکا تھا اور مفکرِ قرآن کے خطاب کے لئے ہمہ تن انتظار تھا۔ رفیقِ گرامی چوہدری محمد لطیف صاحب کے حسنِ انتظام کے تصدق، ہر شے اپنے اپنے مقام پر موجود تھی۔ البتہ تیز ہوا کی مسلسل جنبشوں سے پنڈال میں کچھ ردّ و بدل کرنا پڑ گیا تھا لیکن اس سے اجلاس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ پھر تین بجے اجلاس کی کارروائی تلاوتِ قرآن کریم سے شروع ہوئی تو مرزا محمد خلیل صاحب مائیک کے سامنے آئے۔ پژمردہ فضا، افسردہ چہرے، خود مرزا صاحب کی آنکھیں نمناک اور اس عالم میں جب انہوں نے پورے سوز و گداز سے کہا کہ

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

تو محفل میں کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو اور بعض گوشوں سے تو سسکیوں تک کی آواز سنی گئی۔ اتنے میں مفکرِ قرآن عجیب کیفیات کا ہجوم اپنے جلو میں لئے سٹیج پر آئے اور اُس یقین اور اعتماد کے ساتھ، جس نے تاریک سے تاریک تر حالات میں بھی اُن کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، با وثوق آواز میں اپنے رفقاء کو پکارا اور کہا۔

غمگسارانِ قافلۂ متاعِ بردگاں ۔ لاتخف!

معلوم نہیں اُس لاتخف کے دو الفاظ میں کیا اعجاز مضمر تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس سے محفل کی فضا بدل گئی۔ اس خطاب میں انہوں نے پاکستان کی گذشتہ پچیس سالہ تاریخ پر جس برق نگہی سے تبصرہ کیا وہ انہی کا حصہ تھا، اور ان تمام وادیوں سے گزرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے اور جب آخر میں انہوں نے تابندہ امیدوں کے جلو میں مستقبل کی نشاندہی کی تو اُن کے ایک ایک لفظ کے ساتھ ایسا نظر آتا تھا گویا سامعین کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔

کہے جاں پیامِ قاصد یونہی جانِ ناتواں سے
کہ فضا بدل چکی ہے تری جنبشِ زباں سے

اور جب یہ جنبشِ زبان اپنی آخری حد تک پہنچی تو فضا فی الحقیقت بدل چکی تھی۔ پرویز صاحب بالعموم اپنا پہلا خطاب کنونشن کے دوسرے دن پر اٹھا رکھا کرتے ہیں لیکن اس سال انہوں نے اس خطاب کے لئے پہلی شام ہی کو متعین کر دیا تھا۔ اس نشست کے بعد ہماری سمجھ میں آیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ باہر نکلے تو رفقائے تحریک کی قلبی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ اُن کا حزن و ملال تابندہ آرزوؤں اور اُن کی افسردگی تابندہ امیدوں میں بدل چکی تھی اور جب وہ قیام گاہ میں واپس آئے تو یوں کہیئے کہ ہر سمت سے یہ آواز آ رہی تھی کہ

ابدی بادِ بہارِ تو کہ در انجمنت
کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رستم

نمازِ مغرب کے وقفہ کے بعد ساڑھے سات بجے شام محترم نذیر حسین عارف صاحب کے زیرِ صدارت مندوبین کا دوسرا خصوصی اجلاس شروع ہوا، لیکن اسے جلدی ختم کرنا پڑا کیونکہ اسی پنڈال میں ساڑھے آٹھ بجے احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کی جنرل میٹنگ نیز قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی میٹنگ منعقد ہونی تھی۔ یہ دونوں نشستیں مخصوص تو تھیں انہی سوسائٹیوں کے اراکین کے لئے لیکن چونکہ ان میں یہ کارروائی سامنے آنی تھی کہ مجوزہ کالج کے سلسلے میں اس وقت تک کیا کچھ ہوا ہے اور یہ وہ مسئلہ ہے جو تمام وابستگانِ تحریکِ طلوعِ اسلام کے لئے یکساں دلچسپی اور جاذبیت کا موجب ہے، اس لئے بزموں کے اراکین کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ صرف سامعین کی حیثیت سے ان نشستوں میں شرکت فرما سکتے ہیں۔ سوسائٹی اور کالج کے لئے حصولِ اراضی کے سلسلے میں جو کچھ بتایا گیا وہ بڑا حوصلہ افزا تھا۔ چونکہ اِن نشستوں کی کارروائی ان سوسائٹیوں سے متعلق تھی، اس لئے اس کی روئیداد اس مقام پر شائع نہیں کی جائے گی۔ یہ اجلاس قریب رات گئے تک منعقد رہے اور یوں کنونشن کا پہلا دن بڑی بھرپور مصروفیتوں کے ساتھ گزرا لیکن اس خوشگوار تبدیلی کے ساتھ کہ احباب آئے تھے تو بڑے شکستہ خاطر تھے لیکن سوئے تو بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ۔ اور صبح کی اذان کے ساتھ جب جاگے ہیں تو تازہ ولولوں کی دنیا اپنے آغوش میں لئے ہوئے۔

دوسرا کھلا اجلاس

۱۲ر اپریل
بروز جمعہ۔ صبح ۹ بجے

صدارت: محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب
تلاوتِ قرآن کریم: محترم حافظ محمد یونس صاحب

کلامِ اقبال: محترم مرزا محمد خلیل صاحب

یہ عجیب اتفاق تھا کہ امسال کنونشن کی تاریخوں میں ۲۱ اپریل کا دن بھی پڑتا تھا۔ جسے ملک بھر میں "یوم اقبال" کی تقریب کے طور پر منایا جاتا ہے۔ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ وہ ۱۹۳۰ء کے پاکستانی ہیں جب علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ پرویز صاحب اس کے بعد اس تصور کے نقیب رہے۔ اس سلسلے میں جب ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام لاہور میں ایک معنی میں پہلا یوم اقبال منایا گیا۔ تو شیدایانِ اقبال و پاکستان کا یہ قافلہ علامہ اسلم جیراجپوری علیہ الرحمت کے زیرِ قیادت دہلی سے لاہور آیا۔ اس میں پرویز صاحب نے اقبال اور قرآن کے عنوان سے جو تقریر کی تھی، اس سے آج تک لاہور کی فضا معمور ہے۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کی صبح اس قافلۂ شوق کی ملاقات، علامہ اقبالؒ سے ہوئی جسے پرویز صاحب بصد درد و الم حضرت علامہ سے اپنی آخری ملاقات کے طور پر یاد کیا کرتے ہیں۔ ازاں بعد اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام کا اجراء ہوا تاکہ وہ حضرت علامہ کے اُس پیغام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنے، جسے عملی پیکر عطا کرنے کے لئے قائد اعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کی بنا ڈالی تھی۔ پرویز صاحب نے ۱۹۴۷ء تک قائد اعظمؒ کے زیر ہدایت حصولِ پاکستان کی جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا اور پھر تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک ان کی زندگی کا ایک سانس بھی ایسا نہیں گزرا جس میں اس فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت نہ کی ہو، جس کی آماجگاہ اس خطۂ پاک کو بننا تھا۔

ظاہر ہے کہ یومِ اقبال کے منانے کی تقریب کی مستحق ان سے زیادہ اور کون سی ہستی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ۲۱ اپریل کی صبح کی یہ نشست اسی تابندہ مقصد کے لئے وقف تھی۔ شہر میں کئی ایک مقامات پر یہ تقریب منائی جا رہی تھی۔ گلبرگ، لاہور شہر سے کافی فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان پبلک مواصلات کا انتظام بھی اطمینان بخش اور قابلِ اعتماد نہیں۔ بایں ہمہ شیدا اقبال کو اس نقیبِ اقبال کی زبان سے سننے کی کشش تھی کہ کنونشن کا پنڈال وقت سے پہلے بھر گیا۔ پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا — اقبال اور نظریۂ پاکستان — خطاب برجستہ تھا اور پرویز صاحب کے برجستہ خطابات کے نوٹس لینا کچھ آسان کام نہیں اور پھر اس میں راقم الحروف کی یہ معذرت بھی تو شامل ہے کہ خطاب اتنا جاذب تھا کہ کسی نقطہ کی تسوید کے لئے اگر کسی وقت قلم اٹھانے کو جی بھی چاہتا تھا تو جذب و کیف یہ کہہ کر ہاتھ پکڑ لیتا تھا کہ

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشہ را

مجھے بیحد افسوس ہے کہ یہ نہایت جامع، پُر از معلومات، بصیرت افروز، حقائق پرور، شگفتہ و شاداب خطاب کہیں چھپ نہیں سکے گا، بجز اس کے کہ کبھی خود پرویز صاحب ہی اتنی فرصت پا سکیں کہ اُسے ضبطِ تحریر میں بھی لے آئیں۔ کیف و مستی کی یہ بہار آفریں نشست تقریب ساڑھے بارہ بجے بادلِ نخواستہ اس لئے ختم کرنی پڑی کہ شرکائے مجلس نے جمعہ کی نماز کے بعد پھر دوپہر کے ڈھلتے ڈھلتے اجلاس میں بھی شرکت کرنی تھی۔ ورنہ جب کیفیت یہ ہو کہ

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

یعنی موضوع ہو پیامِ اقبالؒ اور قرآن کریم، اور زبان ہو مفکرِ قرآن کی تو پھر یہ جوئے رواں ایک بحرِ ناپید اکنار بن جاتی ہے۔ محفل جھوم جھوم کر تشنگی اور استہلائے سرشاری کے عالم میں مساجد کی طرف رواں ہو گئے۔

تیسرا کھلا اجلاس

بروز جمعہ

بوقت ۳ بجے

صدارت: محترمہ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف صاحبہ - پرنسپل لاہور کالج فار ویمن

تلاوت: محترم حافظ عبدالمجید صاحب - پنڈ دادن خان

پیامِ اقبال: محترم مرزا محمد خلیل صاحب

سٹیج سیکرٹری: محترم ظفر احسن محمود صاحب

تعلیم کے مسئلہ کی طلوع اسلام کے نزدیک جو اہمیت ہے، اس سے قارئین طلوع اسلام بخوبی واقف ہیں اس کی تشخیص یہ ہے کہ معاشرہ میں موجودہ خلفشار، انتشار اور فساد کی بنیادی وجہ ہمارے نظامِ تعلیم کی خرابی ہے۔ حتیٰ کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا، طلوع اسلام کے نزدیک اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ بنابریں ضروری سمجھا گیا کہ کنونیشن کا ایک کھلا اجلاس اس مسئلہ پر بحث و گفتگو کے لئے منعقد کر دیا جائے۔ اس کی صدارت کے لئے ملک کے نامور ماہرِ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اجمل صاحب نے اظہارِ رضامندی فرمایا تھا لیکن عین وقت پر انہیں لاہور سے باہر تشریف لے جانا پڑا لیکن فطرت کی نظرِ التفات کی وجہ سے ہمیں مسندِ صدارت کے لئے ایک نعم البدل مل گیا یعنی لاہور کالج فار ویمن کی پرنسپل، ملک کی ممتاز ماہرِ تعلیم خاتون ڈاکٹر مس کنیز فاطمہ یوسف صاحبہ نے اپنی تشریف آوری سے ہمیں نوازا۔ یہ اجتماع پُر کیف بھی تھا اور پُر شکوہ بھی۔ کیونکہ اس میں ممتاز اربابِ دانش و بینش نے جو مسئلہ تعلیم سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں والہانہ انداز سے شرکت فرمائی تھی۔ سب سے پہلے بزمِ کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے جنہیں احبابِ طلوع اسلام کا دائرۃ المعارف کہا کرتے ہیں مسئلہ تعلیم کے متعلق طلوعِ اسلام کی پچیس سالہ جدوجہد کی داستان کو اس ایجاز اور رعنائی سے چند صفحات میں سمو دیا کہ کوئی تفصیل چھوٹنے نہ پائی اور کوئی تصویر اپنی حد سے آگے نہ بڑھی۔ انہوں نے اس داستان کا آغاز ۱۹۳۸ء سے کیا تھا اُن کے مقالہ کے ختم ہونے پر راقم الحروف نے مائیک سنبھالا اور سامعین سے کہا کہ میں اختبارِ الاسلام کا ضمیمہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ داستان ۱۹۳۸ء سے شروع نہیں ہوئی، اس کا آغاز اس سے بھی دس سال پہلے ۱۹۲۸ء سے ہوتا ہے حسرت موہانی کے الفاظ میں اُس زمانے سے جب ابھی ؎

حسن سے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے

تحریکِ پاکستان کے دوران جب مہاتما گاندھی نے دیکھا کہ اُن کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوتا تو اُس نے ایک گہری شاطرانہ تدبیر سوچی۔ اُس نے ایک تعلیمی اسکیم تیار کی اور نہایت معصومانہ انداز سے اُسے ملک میں عام کر دیا۔ چاروں طرف سے اس اسکیم کی مدح و ستائش سے غلغلے بلند ہوتے لیکن اسی مفکرِ قرآن کی نگۂ دور رس نے اس کے اندر چھپے ہوئے خطرات کو بھانپا۔ طلوعِ اسلام میں اس پر نہایت جامع بھرپور تنقید شائع کی۔ اُس تنقید کے ہزارہا کی تعداد میں پفلٹ شائع کئے گئے۔ ملک کی کم از کم چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس سے اُس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف وہ اسکیم ہی عنت ربود ہو گئی بلکہ اس کے نصاب کی مطبوعہ کتابوں کو بھی غرقِ سمندر کرنا پڑا۔

ازاں بعد احبابِ طلوعِ اسلام کی جانی پہچانی ہستی سیلے پرویز سٹیج پر آئیں۔ یہ وہی بیٹی ہے جس نے آج سے قریب دس سال پہلے جب وہ چھوٹی سی بچی تھی تو طلوعِ اسلام کنونشن میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب تک آپ بزرگ اپنا کام نہیں کرتے

آپ کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد وہ مسلسل ہر کنونشن میں اپنے اس مطالبہ کو دہراتی رہی اور اپنی تعلیمی منزلیں بھی طے کرتی چلی گئی۔ آج جب وہ اسٹیج پر آئی ہے تو اُس کے ایک ہاتھ میں اپنی تقریر کا مسودہ تھا اور دوسرے میں ایم۔ اے کی ڈگری۔ اور تقریر ایک مربوط سلسلہ تھا، اُن تقاضوں کا جسے وہ ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنے بزرگوں کے سامنے اتنے عرصے سے مسلسل پیش کرتی چلی آرہی تھی۔ تقریر بڑی دلآویز تھی اور پُر تاثیر بھی۔

اُس کے بعد ساہیوال کے ایڈووکیٹ محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب تشریف لائے۔ اُن کے مقالہ کا عنوان تھا۔

'روحِ سرسیدؒ بہیکرِ پرویز میں'

انہوں نے سرسید علیہ الرحمۃ کی مساعیٔ جمیلہ کا بڑا پُر کیف نقشہ کھینچا اور اُس کے بعد نہایت پُر اثر انداز میں یہ کہا کہ اب ہمیں نظر آرہا ہے کہ سرسیدؒ کے پروگرام کی تکمیل ہمارے دور کے سرسیدؒ پرویز کے ہاتھوں ہوگی۔ ہمارا اسلام صاحب کا مقالہ اسی اشاعت میں شامل ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی قرآن کریم سے وابستگی پرویز صاحب کے ساتھ اُن کے والہانہ مراسم سائنس کے انکشافات کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لینے کی اُن کی حیرت انگیز کاوشیں —— قارئین طلوع اسلام بالعموم اور شرکائے کنونشن بالخصوص ان سے واقف ہیں اور اُن کی اِن کاوشوں کے ماحصل یعنی اُن کی کتاب

"Phenomenon of nature & the Quran"

پر تبصرہ بھی طلوعِ اسلام کے ان صفحات پر آچکا ہے۔ احباب کے تقاضا پر انہوں نے اپنی اس کتاب کا آپ تعارف کرایا کیونکہ یہ مسلّہ ہے کہ

تصنیف را مصنف، نیکو کند بیاں

ڈاکٹر صاحب کا انداز خطیبانہ نہیں معلمانہ ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے۔ اُن کے اس تعارف سے قرآن اور سائنس کے کئی حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آگئے۔

اور اس کے بعد محترم صدر جلسہ کے ارشادات گرامی سامعین کے لئے سماعت نواز ہوتے۔ تعلیم کا موضوع اور ایک ایسی قابل اور فاضل ہستی جس کی زندگی کے شب و روز اسی مسئلہ پر غور و فکر میں گذرے ہیں اور جسے موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص و اسقام کا عملی تجربہ ہے —— غور فرمائیے کہ انہوں نے اس باب میں کیا کچھ نہیں کہا ہوگا۔ ہم ہی نہیں بلکہ جملہ سامعین اُن کے بصمیم قلب شکر گذار رہتے کہ انہوں نے اپنے ایسے پاکیزہ اور بلند خیالات سے مشرف فرمایا۔ مغرب کی نماز سے ذرا پہلے، علم و عرفان کا یہ نورانی اجتماع بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

—— (٠) ——

چوتھا کھلا اجلاس

۲۱؍ اپریل - بروز جمعہ
بوقت - ۷ بجے شام

چونکہ نماز جمعہ کی وجہ سے دوپہر کا اجلاس ذرا دیر سے شروع ہوا تھا، اسی نسبت سے شام کا اجلاس بھی مقررہ وقت سے تھوڑی دیر بعد شروع ہوا اور محترم مرزا محمد خلیل صاحب کے زیرِ صدارت محترم پرویز صاحب نے اپنا وہ خطاب پیش کیا جو نومبر ۱۹۷۱ء کی مجوزہ کنونشن کی تقریب پر لکھا گیا تھا اور جس کا عنوان تھا "پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ"۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُس خطاب میں پرویز صاحب نے جو کہا تھا کہ اگر اہلِ پاکستان نے اپنی روش میں بہت جلد تبدیلی نہ کی تو اب نظر

آتا ہے کہ فطرت اپنا فیصلہ صادر کر دے گی اور پھر اُس تباہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ نومبر میں یہ خطاب تو پیش نہ کیا گیا لیکن فطرت نے دسمبر میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور وہ کچھ ہو کر رہا جس سے دل دھڑکتا تھا۔ یہ خطاب چند صفحات بعد آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ آپ دیکھئے کہ مفکرِ قرآن نے قرآن میں بیان کردہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، وہ کس طرح صحیح تھا۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ قرآن مجید ان تاریخی نوشتوں کو بیان کس مقصد کے لئے کرتا ہے۔ نو بجے کے بعد یہ بصیرت افروز محفل اُس وقت برخاست ہوئی جب میر سامان محترم محمد رشید صاحب کی طرف سے آواز آئی۔

بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

رشید صاحب میر سامان اور میر مطبخ دونوں کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور کئی سالوں کے تجربہ نے انہیں ماہر کار بنا دیا ہے۔ کنونشن میں ایک وقت میں کم و بیش ڈیڑھ دو سو کے قریب مہمان دستر خوان پر موجود ہوتے ہیں، کیا مجال جو کھانے میں ذرا سی کمی بیشی ہو جائے یا کسی کو کچھ مانگنے کے لئے آواز تک بھی دینی پڑے۔ رشید صاحب نہایت سکون و سکون سے تبسم بر لب چار پانچ دن شب و روز یہ اہم فریضہ جس خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں، مہمانوں کے دل میں اُس کی یاد آئندہ کنونشن تک تازہ رہتی ہے۔ مہمان کھانے اور نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پنڈال سے پھر آواز آگئی۔

موجودہ دور میں اخبار، فلم، ٹیلی ویژن ایسے ذرائع ابلاغ ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدلی جا سکتی ہیں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کے پاس ان میں سے کوئی ذریعہ بھی نہیں لیکن بزم کراچی نے آج سے کچھ سال پہلے ایک ایسی طرح ڈالی جس کے نتائج بڑے ہی خوشگوار مرتب ہوئے۔ انہوں نے کنونشن کے سٹیج پر ایک ڈرامہ پیش کیا۔ وہ کوئی ڈرامیٹک کلب نہیں، بزم کے اراکین ہی نہایت شستہ، شائستہ، متین، سنجیدہ انداز میں ڈرامہ پیش کرتے ہیں جو تحریک کے مقاصد کے کسی نہ کسی عنوان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ احباب نے اُن کی اس حسین و سادہ کوشش کو ایسا پسند کیا کہ ہر سال اس کا تقاضا ہونے لگا۔ چنانچہ امسال انہوں نے

شاہیں کا جہاں اور ہے . . . .

کے عنوان سے جو ڈرامہ پیش کیا وہ موجودہ نظامِ تعلیم کی خرابیوں اور صحیح تعلیم کی خوبیوں کا بڑا مؤثر مظہر تھا۔ ناظرین نے اُس کی جی بھر کر داد دی۔

آپ غور کیجئے کہ کنونشن کی کارروائی کا آغاز صبح ۹ بجے سے ہوا اور درمیان میں صرف کھانے اور نماز کا وقفہ دے کر قریب آدھی رات تک سلسلہ جاری رہا اور پنڈال کا یہ عالم تھا کہ اس میں کسی نشست میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ آپ سوچئے کہ اس قسم کی جاذبیت آپ کو کسی اور تحریک کے پروگراموں میں بھی مل سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قرآنی حقائق دلوں کے ساتھ چپک جاتے ہیں تو اُس کے بعد ہر شے بے لذت ہو جاتی ہے۔

---(۰)---

۱۴ اپریل، ہفتہ صبح ۸ بجے محترم اقبال قمر صاحب (ملتان) کی صدارت میں محترم حافظ عبد المجید صاحب (ڈیرہ اسماعیل خان) کی تلاوتِ قرآن کریم کے بعد مرزا محمد خلیل صاحب کی نظامت میں بزموں کا خاص اجلاس شروع ہوا ۔۔۔ یہ وہ اجلاس تھا جس میں تحریک کے تمام گوشوں کا جائزہ لیا گیا۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا احتساب کیا گیا۔ اور مستقبل کے لئے پروگرام وضع کیا گیا۔ ان فیصلوں کی تفصیلات بزموں کو الگ بھیجی جا چکی ہیں۔ البتہ دو تین اہم قرار دادیں اس روئیداد کے خاتمے پر درج کی

جاری ہیں۔

(۰)

پانچواں کھلا اجلاس۔ مذاکرہ

ہفتہ۔ ۲۲ر اپریل۔ بوقت ۲ بجے دوپہر

صدارت۔ محترم ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف صاحبہ

تلاوت۔ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ

کلامِ اقبال۔ محترم مرزا محمد خلیل صاحب

مذاکرہ کی یہ سالانہ تقریب اب کسی تعارف کی محتاج نہیں رہی۔ اس میں بیشتر طلباء اور طالبات آدابِ خود آگاہی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک خاص موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار پوری آزادی سے کرتے ہیں۔ موضوع بھی اُن کا اپنا انتخاب کردہ ہوتا ہے۔ اس دفعہ موضوع تھا۔

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

او مسندِ صدارت پر محترمہ مس کنیز فاطمہ یوسف صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ اس تقریب کی نزاکت اور انتہائے متانت کے پیشِ نظر اس کے سٹیج سیکرٹری کے فرائض خود مفکرِ قرآن ادا کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تقریب انہی کے زیرِ نظر اس حسن و خوبی، اور شستگی و شائستگی سے سرانجام پاتی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس بھری محفل میں کیا مجال کہ اُن کے سانس لینے کی آواز تک بھی آسکے۔ اس کے ساتھ ہی محفل کی شگفتگی اور شادابی میں بھی کوئی فرق نہ آنے پاتا ہے۔ جام و سنداں کا ایسا دلکش امتزاج شاید ہی کہیں نظر آئے۔ مذاکرہ میں ساتویں آٹھویں جماعت کے بچوں سے لے کر ایم۔ اے فلسفہ تک کے طلباء نے حصّہ لیا اور عام تاثر یہ تھا کہ طلباء کے خطابات کا ایسا بلند معیار اور کہیں نظر نہیں آتا۔ پانچویں جماعت کے ایک بچے گونگی نے تقریروں کی دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا۔ اُس نے سٹیج پر آکر کہا کہ میری تقریر صرف ایک فقرے کی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ وہ تقریر یہ تھی۔

سڑک پر ایک ہپی جا رہا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی۔

"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

اور محفل زعفران زار بن گئی۔ نمازِ مغرب کا وقفہ دے کر یہ محفل دو نشستوں میں آٹھ بجے کے قریب ختم ہوئی۔ دوسری نشست کی صدارت محترمہ بیگم شجاع صاحبہ (ریٹائرڈ) پروفیسر لاہور کالج فار ویمن نے فرمائی۔ مذاکرہ کی تقاریر طلوعِ اسلام کے ایک خاص نمبر میں شائع کی جائیں گی۔

(۰)

چھٹا کھلا اجلاس مجلسِ استفسارات

۲۲ر اپریل۔ بروز ہفتہ۔ رات ۹ بجے

اور نو بجے کے قریب وہ مجلس شروع ہوئی جس کے ختم کرنے کو کسی کا جی نہیں چاہا کرتا اور جس کا انتظار ہر اُس صبح سے

ہو جایا کرتا ہے۔ سامعین کے استفسارات اور اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق پرویز صاحب کے جوابات ۔ بصیرت افروز، حقیقت کشا، نکات آفریں اور اس کے ساتھ شگفتہ و شاداب۔

کنونشن کے ان چار دنوں میں پرویز صاحب کی شبانہ روز مصروفیات، اس حقیقت کی زندہ شہادت ہوتی ہیں کہ مقصد سے عشق انسان میں کس قدر لاانتہا توانائیاں پیدا کر دیتا ہے۔

(۰)

آخری کھلا اجلاس

۲۳؍ اپریل۔ بروز اتوار
بوقت ۹ بجے صبح

صدارت : محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب

تلاوت : محترم حافظ عبدالمجید صاحب

سٹیج سیکرٹری : محترم پروفیسر خالد سلام صاحب

عنوان : "اسلامی سوشلزم"

اس موضوع کی معنویت، افادیت، جاذبیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نومبر میں منعقد ہونے والی کنونشن کے پروگرام میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا اور اس چھ مہینے کے عرصے میں مسلسل تقاضے موصول ہوتے رہے کہ اس خطاب کو جلد از جلد شائع کر دیا جائے۔ اس جاذبیت کا نتیجہ تھا کہ آج پنڈال وقت سے بہت پہلے بھر چکا تھا اور اس میں ہر مکتبِ خیال کے سامعین نمایاں طور پر نظر آتے تھے ۔۔ متشدد کمیونسٹ، میانہ رو سوشلسٹ ۔ "اسلامی سوشلزم" کے دعوے داران، قدامت پرست مذہب کے اجارہ داران، حتیٰ کہ اونچے اونچے سرمایہ پرست، تنظیمات کے نمائندگان، تقریباً تین گھنٹے کے اس خطاب میں جو حقائق و معارف سامنے آئے، سامعین متفق اللسان تھے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے، اس جامعیت کے ساتھ نہ کہیں کچھ سنا گیا ہے اور نہ پڑھا گیا۔ دلائل ایسے قاطع کہ مخالفین تک بھی ان کے قائل، نتائج ایسے مثبت کہ ہر شخص معترف کہ قرآن کے معاشی نظام کے سوا، انسانیت کی نجات کی کوئی اور صورت نہیں۔ خطاب کے اختتام پر صاحبِ خطاب کی خدمت میں چاروں طرف سے تبریک و تحسین کے پھول برسائے گئے اور تقاضا ہوا کہ اس خطاب کی اشاعت عام کی جائے۔ چنانچہ اس کے الگ پمفلٹ بھی چھپوا لئے گئے ۔۔ اور پھر بزموں کے مختصر سے آخری اجلاس کے بعد احباب کے تقاضے پر پرویز صاحب کا **الوداعی خطاب** ۔۔ احباب کے تقاضے پر اس لئے کہ وہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ میرے لئے احباب کی رخصت کا منظر ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور دوسری طرف احباب اس رقت آمیز منظر کے سوز و گداز سے محروم نہیں رہنا چاہتے۔ پرویز صاحب کی وہی کیفیت تھی ۔۔ آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں، بھرائی ہوئی آواز، لڑکھڑاتی زبان، کپکپاتے ہونٹ۔ بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوئے، تب یاد آیا

اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور احباب سے کہا کہ اس وقت زمانہ جس نازک دور سے گزر رہا ہے اور پاکستان تاریخ کے جس موڑ سے گزر رہا ہے، اس میں آپ احباب کی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ شدید

ہوگئی ہیں۔ پاکستان کی ہر تحریک اور تنظیم اپنے اپنے پروگراموں کی ناکامی کی نوحہ خواں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں مایوسی عام ہورہی ہے لیکن اُن کی یہی ناکامی، آپ احباب کی تحریک کی صداقت کی شہادت ہے۔ آپ نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا اور جسے آپ مسلسل دہراتے چلے آرہے تھے، زمانے نے اس کے ایک ایک لفظ کے صحیح ہونے کی شہادت بہم پہنچا دی ــــ لہٰذا جو پیغامِ خداوندی ماضی میں صحیح تھا، وہی مستقبل میں بھی صحیح ہوگا۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہم اُسے پہنچاتے کہاں کہاں تک ہیں۔ فطرت نے اپنا عبرت آموز فیصلہ صادر کرنے کے بعد ہمیں ابھی ایک اور موقع دیا ہے۔ اگر ہم نے اس موقع کو بھی ضائع کردیا تو پھر ــــ ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں ــــ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ ہم قرآن کے پیغام کے عام کرنے میں ایک سانس بھی ضائع نہ کریں ــــ آپ یہ کیجئے، خدا کا قانونِ مکافات اس کے نتائج ظہور میں لے آئے گا۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام!

(۰)

کنونشن کی تین بنیادی قرار دادیں

قرارداد (۱)

(محرک: محمد اسلم صاحب)

جیسا کہ بزموں کے دستورِ اساسی اور اصولی ہدایات میں بالتصریح مذکور ہے طلوعِ اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ۔ نہ ہی اس کا کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے تعلق ہے۔ نہ ہی یہ عملی سیاسیات میں حصہ لیتی ہے۔ اس کا مقصد بغیر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی یا تصادم کے نہایت پُرامن طریق سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے۔ اگرچہ عام حالات میں بھی اسی ہدایت پر عمل درآمد ضروری ہے، لیکن ملک جن خصوصی حالات سے اس وقت گذر رہا ہے، انکے پیشِ نظر اس کی پابندی اشد ضروری ہے۔ بنابریں طلوعِ اسلام کنونشن کے اس اجلاس میں طے پایا کہ:-

(۱) بزمہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان جملہ ارکانِ بزم کی توجہ اس ہدایت کی طرف التزاماً مبذول کراتے رہیں۔

(۲) اگر ان کے علم میں یہ بات آئے کہ بزم کا کوئی رکن اس کی پابندی نہیں کرتا، تو وہ اسے اس سے باز اور محتاط رہنے کی تحریری تنبیہ کرے۔

(۳) اگر وہ رکن اس کے باوجود اس کی پابندی نہ کرے تو نمائندہ اُسے دستورِ اساسی کی شق ۵ کے تحت بزم کی رکنیت سے علیحدہ کردے اور اس کی اطلاع ادارہ کو بلا تاخیر کردے۔

(۰)

قرارداد (۲)

(محرک: ڈاکٹر محمد اکرم مرزا)

پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں قرآن کریم کی ہدایات کے مطابق اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، تحریک طلوعِ اسلام کے نظریہ کے مطابق، اس خطۂ زمین کی حفاظت ملتِ پاکستان

کا دینی فریضہ ہے۔ بنا بریں طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ پاکستان کی حفاظت اور سالمیت کے لئے حکومتِ پاکستان کی طرف سے جو اقدامات بھی تجویز کئے جائیں، بزموں کے اراکین ان میں بقدرِ امکان پورا پورا حصہ لیں۔

قرارداد (۳)

(محرک: محمد اقبال سرور صاحب)

طلوعِ اسلام کالج کا قیام، تحریکِ طلوعِ اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی اور "احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی" جو سعی جمیلہ سرانجام دے رہی ہے، طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس انہیں بنظرِ استحسان دیکھتا ہے اور ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

(ب) یہ بھی طے پایا کہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی سے درخواست کی جائے کہ کالج کی عمارت کی بنیاد رکھنے کے لئے اس درخشندہ منصوبہ کے سرپرستان ایک تقریب کا انتظام کیا جائے جس میں بزموں کے نمائندگان اور دیگر وابستگانِ تحریکِ طلوعِ اسلام کو شرکت کی خصوصی دعوت دی جائے۔

بقیہ: کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا

(مسلسل از صفحہ ۵۶)

اور آج میں آپ کے سامنے اُس وقت حاضر ہوئی ہوں جب میرے ہاتھ میں ایم۔اے کی ڈگری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا تھا کہ ؎

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا؟

لیکن نہیں۔ اس کالج کا تصور تو ہمارے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے۔ اس سے ہم بیگانہ کس طرح ہو سکتے ہیں بلکہ میں اب اسے ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ اس وقت تک میری پکار میں خود غرضی کا شائبہ تھا اس لئے اسکی قبولیت میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اب یہ بالکل بے غرض ہے۔ اس لئے یقیناً جلد بارِ یاب ہوگی۔

کالج بنے گا تو اُس کے در و دیوار سے میری آٹھ سالہ پکاروں کی صدائے بازگشت فضاؤں میں پھیلے گی اور میں انتہائی فخر و مسرت سے یہ کہہ کر بحضور رب العزت اپنا سر جھکا دونگی کہ

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا!

سلمٰی پرویز (ایم۔اے)

کام آخر جذبۂ بے اختیار آہی گیا

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۲ء کے تعلیمی اجلاس میں پڑھا گیا)

میرے محترم بزرگو! اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو۔

میں یہ سلام گزشتہ دس سال سے ہر کنونشن میں آپ کی خدمت میں پیش کرتی اور آپ کی دعائیں لیتی چلی آرہی ہوں۔۔۔۔

۱۹۶۲ء کی کنونشن کا ذکر ہے، میں اس زمانے میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی میں نے اپنی استعداد کے مطابق آپ کی تقریروں کو بڑی دلچسپی سے سنا اور اس کے بعد میں نے بھی کچھ کہنے کی اجازت مانگی تو آپ کی بزرگانہ شفقت نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اسٹیج پر بلا لیا۔ میں نے جو کچھ عرض کرنے کی جرأت کی تھی اُسے آج دس سال کے بعد دہرانے کی اجازت چاہتی ہوں۔ بابا جی بچوں کی چھوٹی عمر کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتے ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ بھی میرے بچپن کی یہ باتیں اسی دلچسپی سے سنیں گے۔ میں نے سلام کے بعد کہا تھا۔

آپ کنونشن میں بڑی بڑی علمی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ کی بیٹی آپ کو ایک بڑی مزیدار ہنسی کی بات سنانا چاہتی ہے ہماری کوٹھی میں کچھ پیڑ لگے ہوئے ہیں۔ ایک رات سخت آندھی آئی جس سے ایک پیڑ جڑ سے اکھڑ کر گر پڑا۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ ہمارے مالی کا لڑکا اس پیڑ کے پتوں پر فوارے سے پانی چھڑک رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ دتے! یہ کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا کہ بی بی جی! اس کے پتے مرجھا رہے ہیں! ان پر پانی چھڑک رہا ہوں تاکہ ہرے ہو جائیں۔ اس کی بات سنکر ہم سب ہنسے کئی دنوں تک اس کا چرچا رہا کہ پیڑ جڑ سے اکھڑ گیا ہے اور یہ پتوں پر پانی چھڑک رہا ہے کہ وہ ہرے ہو جائیں! آپ بھی اس بات پر ضرور ہنسے ہونگے لیکن میرے بزرگو! اگر آپ اس بٹیا کی بات کا بُرا نہ منائیں تو سوچئے کہ کیا آپ بھی یہی نہیں کر رہے کہ آپ کے بچوں کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہو رہی ہے اور آپ پتوں پر پانی چھڑک رہے ہیں۔ آپ ہمارے کھانے پینے کا بہت اچھا انتظام کرتے ہیں۔ اچھے اچھے کپڑے بنوا کر دیتے ہیں۔ ہماری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اسکول کی فیس ادا کرتے ہیں۔ کتابوں کا خرچ برداشت کرتے ہیں لیکن یہ تو ہماری زندگی کے درخت کے پتے ہیں۔ اس کی جڑ وہ تعلیم ہے جو ہمیں مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ وہ تعلیم کس قسم کی ہے؟ اس تعلیم میں اس قسم کے کیڑے ہیں جو جڑوں میں لگ جائیں تو پتوں کو لاکھ پانی دیجئے زندگی کا درخت کبھی ہرا بھرا نہیں ہو سکتا۔

میرے بزرگو! ہم بڑے نازک پودے ہیں۔ ہمارے پتوں پر ہی پانی نہ چھڑکتے رہیئے۔ ہماری جڑوں کا بھی خیال کیجئے۔ خدا کرے کہ ہماری قوم کے اللہ دتوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے۔

دو سال کے بعد میں ۱۹۶۷ء کی کنونشن میں حاضر ہوئی تو میں نے حسب معمول سلام کے بعد عرض کیا۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! آپ کے سامنے سوال یہ ہے کہ ہماری طلوع اسلام کی تحریک کے راستے میں کونسے سنگ گراں ہیں جو اس کی رفتار میں رکاوٹ بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے مختلف تقریروں میں اس اجمال کی تفصیل سنی لیکن وہ جگ بیتی تھی میں آپ کو آپ بیتی سنانا چاہتی ہوں

میری آنکھ اس گھر میں کھلی جس کی فضا طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے معمور تھی بچپن ہی سے قرآن پاک کی تعلیم سے کان آشنا ہو گئے جب میں تقریباً پانچ سال کی ہوئی تو اسکول بھیجنے کا سوال سامنے آیا۔ ہم اس زمانے میں کراچی میں تھے۔ کراچی میں اُس وقت، صرف عیسائی مشنریوں کے اسکول ایسے تھے جن کی شہرت اچھی تھی ۔۔۔ لیکن ان میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ کئی ماہ کے انتظار کے بعد خدا خدا کر کے داخلہ ملا۔ میں خوشی خوشی اسکول گئی۔ اسکول کے صحن میں سنگ مرمر کا حضرت یسوع مسیح کا مجسمہ تھا۔ میں نے اوپر نگاہ اٹھائی تو اتفاق سے ایک کوا اُس مجسمے کے سر پر بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے وہاں بیٹ کر دی تو میں نے سسٹر سے کہا۔ کہ ذرا خود بتلایئے کہ جو اپنے اوپر سے کوے کو بھی نہیں اڑا سکتا، درآں حالیکہ وہ اس کے سر پر بیٹ کر رہا ہے، وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ سسٹر خاموش رہی لیکن اس نے غصے میں میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ دو تین دن کے بعد، وہ کلاس میں ہمیں بتا رہی تھی کہ ہمارے خداوند خدا یسوع مسیح ہمیں دوزخ کی آگ سے بچائیں گے۔ اس دن گرمی بڑی سخت تھی اور حضرت مسیح کا مجسمہ دھوپ میں کھڑا جل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ سسٹر، جو خدا اپنے آپ کو دھوپ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا، وہ ہمیں دوزخ کے عذاب سے کیسے بچائے گا!

دوسرے دن پرنسپل نے بابا جی کو بلا کر کہہ دیا کہ آپ کی بیٹی ہمارے اسکول میں نہیں رہ سکتی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک اور اسکول میں داخلہ ملا۔ وہ مسلمانوں کا اسکول تھا۔ امتحان قریب آئے تو استانیوں نے کہا کہ کل اسکول میں آیت کریمہ کا ختم ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ اس میں کیا ہوگا اور اس سے کیا مقصد ہے۔ استانی نے کہا کہ سوا لاکھ بار آیت کریمہ پڑھی جائے گی اور جو لڑکیاں اس میں حصہ لیں گی وہ امتحان میں کامیاب ہو جائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ سارا سال ہمیں یہ کہتی رہتی ہیں کہ محنت کرو۔ خوب پڑھائی کرو۔ تاکہ تم امتحان میں پاس ہو جاؤ۔ اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جو لڑکی آیت کریمہ کے ختم میں حصہ لیگی وہ امتحان میں پاس ہو جائے گی۔ اس کا مطلب کیا ہوا۔ بات بڑھ گئی اور اسکول کی ساری استانیاں میرے خلاف ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ لاہور آنے پر جس اسکول میں داخلہ ملا وہ اگرچہ گورنمنٹ کا اسکول تھا لیکن استانیاں سب مسلمان تھیں۔ اب یہاں اسلامیات بھی پڑھایا جاتا تھا۔

امتحان میں سوال آیا کہ شب برات کیوں منائی جاتی ہے اس کی اہمیت بیان کرو۔ میں نے لکھا کہ یہ آتش پرستوں کا تیوہار تھا۔ عباسی خلیفوں کے وزیر نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ اس تیوہار کو اپنے ساتھ لائے اور اسے اسلامی رنگ دے دیا۔ یہ بیان اسلامیات کی کتاب سے بھی مختلف تھا اور مسلمانوں کے مروجہ عقیدہ سے بھی۔ نتیجہ یہ کہ اسلامیات میں فیل کر دی گئی ۔۔۔ بابا جی سے پوچھا کہ بتایئے ہم ایسے میں کیا کریں۔ اگر کتاب کے مطابق لکھتے ہیں تو طلوع اسلام کی پیش کردہ فکر کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی اس تعلیم کے خلاف جسے ہم سچا سمجھتے ہیں۔ اگر سچائی کے مطابق لکھتے ہیں تو فیل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی بات میں نے کئی سال اُدھر آپ بزرگوں سے بھی پوچھی تھی۔ اور آپ نے بھی اس کا جواب کچھ نہیں دیا تھا۔

پچھلے سال کچھ امید کی کرن نظر آئی تھی جب آپ نے کنونشن میں اپنا کالج کھولنے کی تجویز پاس کی تھی۔ ہم نے خیال کیا تھا کہ اس سال آپ آئینگے تو اس کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا۔ لیکن اس کنونشن میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب آپ کنونشن

کے بعد پھر واپس تشریف لے جاتیں گے اور ہم پھر اسلامیات کا یہ درس دہرانے لگ جائیں گے کہ شام کے وقت سورج اللہ میاں کے عرش کے نیچے جا چھپتا ہے اور دوسری صبح فرشتے آ کے کچھ کے دے کے وہاں سے نکالتے ہیں۔ اور اس کے بعد آپ پھر مذاکرہ منعقد کریں گے، یہ سوچنے کے لئے کہ طلوع اسلام کی آواز تیزی سے کیوں نہیں پھیلتی۔

میرے بزرگو! جب تک ہماری تعلیم کا نصاب نہیں بدلتا طلوع اسلام کی آواز آگے نہیں جا سکتی۔ آپ نے کچھ کرنا ہے تو یہ کیجئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کریں گے اس سے آپ کو ثواب تو ضرور ہو گا لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ لیکن پھر مصیبت یہ ہے کہ آپ اس ثواب کے بھی تو قائل نہیں جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ بہرحال تعلیمی بے بسی اور طلوع اسلام کی آواز نے ہمیں تو اس کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

جب تک آپ ہمیں اس کشمکش سے نہیں نکالتے طلوع اسلام کی کشتی اس گرداب سے نہیں نکل سکتی۔ یہ میں نے ۱۹۶۸ء میں کہا تھا۔ دو سال پھر گزر گئے۔ اس سال بابا جی پر بیماری کا سخت حملہ ہوا اور ان کی صحت بڑی گر گئی تو میں نے ۱۹۷۰ء کی کنونشن میں آپ کی خدمت میں عرض کیا:۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! آج کی تقریریں بڑی دلچسپ تھیں۔ شاعری ہوتی ہی بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے ان تقاریر کو شاعری کہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے بہت سے کان کھڑے ہو جائیں اور بہت سی آنکھیں مجھے گھور کر دیکھیں لیکن اس سے حقیقت نہیں بدل جائے گی ـــــ شاعری کرتی کیا ہے؟ وہ ایک تشبیہ لیتی ہے اور اسے حقیقت بنا کر پیش کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی آج یہاں ہوا ہے۔ موضوع کے عنوان میں کہا تھا کہ

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی!

اس کی تشریح کرتے ہوئے ہمیں بتایا گیا کہ فطرت کا قاعدہ ہے کہ ہر شب کے بعد سحر ہوتی ہے اور جب خود سحر قریب ہو تو ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور چاند کا چہرہ افسردہ ہو جاتا ہے۔ پھر سحر طلوع ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شب کے بعد سحر ہوتی ہے لیکن اس قسم کی سحر فطرت مجبور کے لگے بندھے قاعدے کے مطابق نمودار ہوتی ہے۔ اسے نہ کسی کی شدت آرزو وقت سے پہلے لا سکتی ہے، نہ کسی چمگادڑ کی آنکھ اسے نمودار ہونے سے روک سکتی ہے۔ یہ سحر خارجی کائنات کی سحر ہوتی ہے لیکن ے

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

سوال یہ ہے کہ کیا مومن اُس اذان کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس سے اس قسم کی سحر نمودار ہوتی ہے؟ جہاں تک فطرت کے شب و روز کا تعلق ہے اس میں نہ تو رات کی تاریکی انسانوں کے سیاہ اعمال کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور نہ ہی صبح کی روشنی اُن کے حسن عمل کی تخلیق۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں تاریکیاں بھی ان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ اس لئے نور سحری انہیں خود ہی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے حسن عمل کی ایسی قندیلیں روشن ہو چکی ہیں جن سے ہمارے نامۂ اعمال کی تاریکیاں چھٹ جائیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یونہی ایک تشبیہ سے خوش ہو جانا کہ ـــــ سحر ہو کے رہے گی ـــــ شاعری سے زیادہ کچھ نہیں۔

چراغ گل کر کے بیٹھ جانا تو کچھ دلیلِ سحر نہیں ہے

یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک دوسری اقوام کا تعلق ہے اُن کی شدتِ اضطراب ایک عظیم انقلاب کی آئینہ دار ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس سے نمود سحر ضرور ہوگی۔ لیکن اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ ہماری رات تو اُسی طرح تاریک کی تاریک ہی رہے گی۔ میں بڑے بڑے مسائل سمجھنے کی مدعی نہیں۔ میں تو آپ کی چھوٹی سی بیٹی ہوں اور میری باتیں بھی چھوٹی چھوٹی سی ہوتی ہیں۔ میں مسلسل پانچ سال سے ہر کنونشن میں ایک ہی بات دہرا رہی ہوں اور وہ یہ کہ جب تک آپ ہم بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا صحیح انتظام نہیں کریں گے ہماری شبِ تاریک میں نمود سحر نہیں ہوگی۔ آپ ہر سال مجھ سے وعدہ کرکے چلے جاتے ہیں لیکن مجھے اِس وقت تک اس میں نمودِ سحر کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ میں آپ سے درخواست کروں گی کہ بجائے اس کے کہ ہم مطمئن ہوکر بیٹھ جائیں کہ ہم کچھ کریں یا نہ کریں سحر پیدا ہو کے رہے گی۔ ہمیں چاہیئے کہ

لے کے خورشید جہاں تاب سے مقراضِ شعاع
دامنِ شب میں گریبانِ سحر پیدا کریں!

میں بزرگانِ گرامی قدر! اس مرتبہ اس درخواست کو اور بھی شدت سے پیش کرنے کی جرأت اس لئے کر رہی ہوں کہ — خدا میرے بابا جی کی ہزار سال کی عمر کرے لیکن — فطرت کے قاعدے بڑے اٹوٹ واقع ہوئے ہیں۔ ڈر ہے کہ — اس کے بعد میری ہچکی بندھ گئی — میں سکتہ میں ڈوب گئی — کچھ وقت کے بعد میں نے تھوڑی سی ہمت پائی اور بھرائی ہوئی آواز سے کہا کہ اس کے بعد میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ:

شبِ ہجراں کے جاگنے والو ✤ کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی!

اس پر اہلِ محفل کی آنکھوں سے جس طرح آنسو رواں تھے اُس منظر کو میں آج تک بھول نہیں سکی۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے نہ بھولے ہوں گے، کہ ہنسی تو بھلائی جاسکتی ہے آنسو نہیں بھلائے جاسکتے۔ یہ کچھ میں نے ۱۹۶۷ء میں کہا تھا۔

(۰)

اس کے بعد ۱۹۶۹ء کی کنونشن میں یہ نوید جانفزا فردوسِ گوش ہوئی کہ کالج کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھالیا گیا ہے تو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا:

میرے محترم بزرگو! لیجئے آپ کی وہ بیٹی آگئی جس کے روز روز کے شکووں سے تنگ آکر آپ نے سال گزشتہ مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب طلوعِ اسلام کالج بنا کر ہی دم لینگے۔ اور مقامِ تشکر ہے کہ آپ نے اپنے اس ارادے کو بڑی حد تک عملی پیکر بھی عطا کر دیا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ جس کے مقدر میں گلہ اور شکوہ لکھا ہو اس کے لئے مقامِ تشکر میں بھی شکوہ کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ میں غالباً آٹھویں جماعت میں تھی جب میں نے کالج کی پکار شروع کی تھی۔ آپ نے اپنی بیٹی کی مسلسل پکار کو نوازا اور کالج کی بنیاد رکھ دی لیکن کب؟ جب آپ کی بیٹی بی۔ اے کر چکی۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

میں اس پر بھی خوش تھی کہ میں نہ سہی میرے پیچھے آنے والی میری چھوٹی بہنیں اس سے فائدہ اٹھائیں گی۔ لیکن واحسرتا! کہ میری اس آرزو پر بھی اوس سی پڑ گئی جب میں نے سنا کہ کالج لڑکوں کے لئے کھل رہا ہے لڑکیوں کے لئے نہیں۔

میری شکایت پر مجھے یہ کہہ کر دلاسا دیا گیا کہ کالج ابتداءً لڑکوں کے لئے کھل رہا ہے لیکن اس کے بعد لڑکیوں کے لئے بھی انتظام کر دیا جائے گا — یہ غالباً اُس "افسانے" کا اثر ہے جس کی رُو سے سمجھا جاتا ہے کہ خدا نے ابتداءً آدمی کو پیدا

کیا تھا۔ اور اس کے بعد عورت کو لہٰذا لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بیک وقت تعلیم کا انتظام کر دینا "مشیتِ خداوندی" کے خلاف ہوگا۔ میری بہنیں سوچ سکتی ہیں کہ اس منطق کا جواب کیا ہو سکتا ہے، بالخصوص جب خدا کو درمیان میں لے آیا جائے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ یہ بہت جلد ہو جائے گا۔ بہت ہی جلد۔ — میں کون ہوں جو اپنے بزرگوں کی بات پر اعتماد نہ کروں۔ — بزرگوں کی بات پر اعتماد کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر ؎

تری محبت کا بھی یقیں ہے، تری وفاؤں کو مانتا ہوں
مگر مرا دل لرز رہا ہے، میں اپنی قسمت کو جانتا ہوں

میری قسمت میں شاید ابھی کچھ اور سال اپنی پکار کو دہرانا لکھا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ لڑکیوں کی قسمت کا لکھا الٹ ہوتا ہے۔ یہ میں نے ۱۹۶۹ء میں کہا تھا۔

(۰)

اور اس کے بعد ۱۹۷۰ء کی کنونشن آئی تو میں آٹھویں جماعت سے چلتے چلتے ایم۔ اے (فائنل) میں پہنچ چکی تھی اس کنونشن میں میں نے عرض کیا۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو! میں آپ کے سامنے حاضر ہوتی ہوں تو دیکھ رہی ہوں کہ آپ میں سے اکثر بزرگوں کے چہروں پر مجیب قسم کی معنی خیز ہنسی پھیر گئی ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہے ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہیں کہ

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

لیکن آپ مطمئن رہیں حسنؔ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اب اپنا قصہ نہیں چھیڑے گا آپ اطمینان سے سوئیے۔ سالِ گذشتہ جب میں نے غالباً آٹھویں بار کالج کی تعمیر کے متعلق آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلایا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ بات اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ

ان کی مژگاں پر ستارے، اپنے ہونٹوں پر ہنسی!
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے!

تو میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب آپ کو اس کی یاد کبھی نہیں دلاؤں گی۔ مجھے اتنا گلہ ضرور تھا کہ ؎

جن اسیروں کے مقدر میں نہ تھی سیرِ چمن،
اُن کو آخر کیوں بہاروں کے پیام آتے رہے؟

مجھے یقین ہے کہ کالج بنے گا اور ضرور بنے گا۔ میرے ابا جی کا کوئی خواب آج تک بغیر تعبیر کے نہیں رہا۔ لیکن میں تو پکارتے پکارتے اپنی تعلیم کے آخری سال میں آ پہنچی ہوں اس لئے ؎

یوں تو فصلِ گل پھر آئے گی مگر،
جو کلی مرجھا گئی، مرجھا گئی!

(۰)

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

خالد سلام ۔ لیکچرر انجینئرنگ یونیورسٹی
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام ۔ لاہور

دارُو کوئی سوچ اُنکی پریشاں نظری کا

(طلوعِ اسلام کنونیشن کی ۱۲ اپریل کی اس نشست میں پڑھا گیا جو تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص تھی!)

محترمہ صدر صاحبہ و سامعینِ گرامی قدر!

میں اس مرتبہ کنونیشن کے انتظامی امور کے سلسلے میں اس قدر مصروف رہا کہ نہ تو کل کو ہونے والے مذاکرہ کے لئے کوئی مقالہ لکھ سکا اور نہ ہی آج کے اجلاس میں شرکت کا میرا کوئی ارادہ تھا لیکن پچھلے دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس امر کا محرک ہو گیا کہ میں اس کشمکش کے سلسلے میں جس میں ہمارا نوجوان طبقہ آجکل گرفتار ہے مختصر الفاظ میں کچھ عرض کروں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ چند ماہ قبل پاکستان ٹیلیویژن پر ایک سلسلہ پروگرام چل رہا تھا جس کا عنوان تھا "آدابِ خود آگاہی" — اس پروگرام میں بالعموم اسلام کا جھٹکا کیا جاتا تھا۔ ۱۳ نومبر کی شب اس سلسلہ کی جو کڑی پیش کی گئی اس کا موضوع تھا ۔ اخلاق کے معنی — حسبِ معمول تین طالب علم (جن میں ایک طالبہ تھیں) مستفسر تھے، اور جواب دینے والے ایک ڈاکٹر صاحب (یعنی Ph. D.) جن کے متعلق بعد میں کسی نے بتایا کہ وہ کراچی یونیورسٹی کے عربک ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں۔ جو کچھ اس پروگرام میں سامنے آیا اسکا مفہوم میرے ذہن میں محفوظ ہے جسے میں کچھ اُن کے کچھ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں — سب سے پہلے یہ سوال سامنے آیا کہ ہم اچھے اخلاق اور بُرے اخلاق کے متعلق عام طور پر گفتگو کرتے رہتے ہیں لیکن اخلاق تو ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں۔ کل جس روش کو نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا آج اسے کوئی بھی بُرا نہیں سمجھتا۔ اور آج جسے بُرا نہیں سمجھا جاتا، کل کو وہی معیوب قرار پا جائے گی۔ تو کیا کوئی ایسا معیار بھی ہے جس کے مطابق اچھے اور بُرے اخلاق کا فیصلہ کیا جا سکے۔

سوال بڑا معقول اور فطری (NATURAL) تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ اس معیار کو خارج میں کہیں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ باہر سے نازل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کے اندر موجود ہے۔ اسے انسانی فطرت کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے ہر انسانی بچے کو ملتی ہے۔ جس بات کو انسانی فطرت اچھا کہہ دے وہ اخلاقِ حسنہ کہلائے گی جسے وہ ناپسند کرے وہ معیوب ہوگی۔ بس یہ ہے معیار۔

اس پر سوال کیا گیا — اور سوال کرنے والوں میں وہ محترمہ طالبہ پیش پیش تھیں — کہ اگر اچھے اور بُرے کا معیار انسانی فطرت ہے جو ہر انسان کے اندر از خود موجود ہے، تو پھر اچھے اور بُرے کے فیصلے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں ایک بات کو اچھا سمجھا جاتا ہے، دوسرے زمانہ میں وہ معیوب قرار پا جاتی ہے۔ پھر ایک ہی زمانے میں ایک قوم ایک بات کو نہایت مستحسن خیال کرتی ہے لیکن دوسری قوم اسے مذموم تصور کرتی ہے

اور ایک ہی قوم میں بعض لوگ ایک بات کو پسند کرتے ہیں، دوسرے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر فطرت ہر انسان کے اندر موجود ہے تو اس کا فیصلہ ہر زمانے، ہر قوم اور ہر فرد کے ہاں یکساں ہونا چاہیئے۔ پھر یہ اختلاف کیوں؟

اس سوال پر جواب دینے والے بزرگ جس بُری طرح سٹپٹائے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کہنے لگے کہ نہیں! فطرت کے ساتھ انسان کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ضمیر کہتے ہیں۔ ضمیر کی آواز حق اور باطل، غلط اور صحیح کا قابلِ اعتماد معیار ہے۔ اس پر سوال پوچھنے والوں نے کہا کہ جو بات ابھی ابھی فطرت کے سلسلہ میں کہی گئی تھی، اس سے کہیں زیادہ اختلافات ضمیر کے سلسلہ میں ابھرتے ہیں۔ خدا کے ماننے والے کی ضمیر کچھ اور کہتی ہے، دہریہ کی ضمیر کچھ اور۔ ایک مسلمان کی ضمیر کا کچھ اور فیصلہ ہوتا ہے عیسائی کی ضمیر کا کچھ اور۔ پھر ایک ہی فرد کی ضمیر ایک وقت میں کچھ اور کہتی ہے، دوسرے وقت میں کچھ اور۔ ابھی ابھی آپ ایک بات کو صحیح قرار دیتے ہیں، لیکن جب آپ کو اسکے خلاف چار دلیلیں دے دی جاتی ہیں تو آپ کی ضمیر خود اپنے پہلے فیصلہ کے خلاف فیصلہ دے دیتی ہے۔ ہمارے اعتراضات ہماری ضمیر کی آواز ہیں۔ لیکن آپ کوشش فرما رہے ہیں کہ ہم اپنی ضمیر کی آواز کو غلط قرار دے کر آپ کی ضمیر کی آواز سے متفق ہو جائیں۔ آپ فرمائیں کہ غلط اور صحیح کا معیار ہماری ضمیر ہے یا آپ کی!

اس پر جواب دینے والے بزرگوار کی جو حالت ہو رہی تھی وہ قابلِ رحم تھی۔ اس بحث کے مصالحت کنندہ (COMPERER) بڑی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو کسی طرح اس ضیق سے نکال لیں۔ لیکن ــــ ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے!

ڈاکٹر صاحب کی مشکل یہ تھی کہ بحث کا وقت ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے انہیں جواب دینا لازم تھا۔ کہنے لگے کہ انسان کو اس لئے عقل دی گئی ہے کہ وہ اس کی رُو سے فیصلہ کرے۔ جھٹ سے سوال ہوا کہ کس کی عقل؟ چور کی عقل یا جس کے گھر چوری ہوئی ہو اس کی عقل! مجرم کی عقل یا اس کا پیچھا کرنے والے سپاہی کی عقل۔ کس کی عقل کا فیصلہ حق پر مبنی سمجھا جائیگا۔

آواز آئی کہ وقت کم رہ گیا ہے۔ اس پر اس طالبہ نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! جلتے جلتے ایک مختصر سا سوال اور! سوال یہ ہے کہ اگر خدا نے ہر انسان کو فطرت یا ضمیر یا عقل عطا کر دی ہے جو حق و باطل، غلط اور صحیح، خیر اور شر کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو پھر اس نے انسانوں کی طرف رسولوں کو کیوں بھیجا؟

اس پر ڈاکٹر صاحب تو غالباً گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے اور میں ان طالب علموں کے خندہ زیر لبی کی طرف جس میں استہزاء کے ہزاروں نشتر پوشیدہ تھے ــــ کہنے لگے کہ خدا کے رسول فطرت اور ضمیر کو تقویت پہنچانے کے لئے آتے تھے۔

جھٹ سے سوال ہوا کہ انسانی فطرت یا ضمیر جس قدر کمزور آج ہو گیا ہے اور اسے جس قدر تقویت کی ضرورت اس زمانے میں ہے اس سے پیشتر شاید ہی اتنی عالمگیر ضرورت ہو گی تو پھر اب رسول کیوں نہیں آتے؟ ــــ مصالحت کنندہ نے یہ کہہ کر اُن صاحب کی جان چھڑائی کہ آج کی بحث کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ امید ہے سامعین نے اس سے کافی استفادہ کیا ہو گا ــــ خدا حافظ!

سامعین نے جس قدر استفادہ کیا ہو گا ہو، لیکن اُن طالب علموں کی تو یقیناً یہ کیفیت ہو گی کہ وہ اگر اسلام کے متعلق اپنے دل میں دس شکوک لیکر آئے ہوں گے تو یقیناً سو شکوک دل میں لے کر وہاں سے گئے ہونگے ــــ قیامت یہ کہ وہ بزرگوار یہ جوابات اپنی طرف سے نہیں دے رہے تھے بلکہ اسے اسلام کی تعلیم کہہ کر پیش کر رہے تھے۔ میں چونکہ خود ایک ٹیچر ہوں، اس لئے مجھے معلوم ہے کہ نہ ہی یہ اعتراضات نئے تھے اور نہ ہی ان کے جوابات پہلی بار سامنے آئے تھے ــــ ہمارے کالجوں میں ہر روز اسی قسم کے

سوالات پوچھے جاتے ہیں اور اسلام کے علمبرداروں کی طرف سے ایسے ہی قسم کے جواب دیئے جاتے ہیں - اور چونکہ یہ جوابات دیئے جاتے ہیں یہ کہہ کر کہ یہ اسلام کی تعلیم ہے - اسی لئے ہمارے نوجوان طالب علم اسلام کیطرف سے دن بدن برگشتہ ہوتے جا رہے ہیں - اب رہی سہی کسر ہماری تعلیم پوزیشن پوری کر رہی ہے -

میں ابھی کراچی کے ان عزیز طالب علموں کی حرماں نصیبی پر رو رہا تھا کہ میرے سامنے لاہور کے ایک کالج کے پروفیسر صاحب کا ایک مقالہ آیا جو روزنامہ "امروز" کی ۱۶ فروری ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا - اس کا عنوان تھا "نیا نظام تعلیم" — اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ یہ (نیا) نظام تعلیم کس قسم کا ہونا چاہیئے - اس سلسلے میں انہوں نے جو بنیادی اصول پیش کیا ہے اسے میں سامعین کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ ہمارے کالجوں میں تعلیم کس قسم کی دی جا رہی ہے - واضح رہے کہ ان پروفیسر صاحب کے مضامین "اسلام، نظریہ پاکستان، اقبالیات وغیرہ موضوعات پر اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں - بلکہ اگر میری معلومات غلط نہیں تو یہ صاحب اسلام کے متعلق دو ایک کتابیں بھی تصنیف فرما چکے ہیں - اپنے زیر نظر مقالہ میں فرماتے ہیں :-

"مہارت اور سکھلائی اور کسی مخصوص علم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور قومی مقاصد کا دوسرا اہم حصہ ثقافتی اور روحانی نصب العین سے تعلق رکھتا ہے - ہم پاکستان میں اپنی نئی نسلوں کو کس قسم کا روحانی اور اخلاقی ضابطہ دینا چاہتے ہیں اور کس قسم کے ثقافتی ذہن کی نشو ونما چاہتے ہیں' اس کا فیصلہ کرنا بھی تعلیم کا نیا نظام بنانے والوں کی ایک نہایت اہم ذمہ داری ہے - اس کا مطلب نئی نسلوں پر کسی جامد اور قطعی روحانی، اخلاقی یا ثقافتی نظام کو مسلط کرنا ہرگز نہیں ہے - ہم جمہوری اصولوں کے مطابق نئی نسلوں کی سوچ اور تکمیل ذوق کی راہوں کو کھلا رکھیں گے - ان کو سوچنے اور فکر کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی - انہیں ہمارے روحانی، اخلاقی اور ثقافتی ورثے کو ناقدانہ طور پر دیکھنے اور ان میں سے کسی چیز کو رد کرنے کا اختیار بھی ہوگا - ہم روحانیت، اخلاقیات یا ثقافت کے نام پر نئے ذہنوں کو مقید کرنا نہیں چاہتے - ان کو کسی مخصوص نظام کا غلام دیکھنا ہمارا مقصد نہیں -"

لیجئے! پروفیسر صاحب نے سرے سے قصہ ہی ختم کر دیا - ہمارے ہاں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ کوئی ناقابل تغیر زندگی کے اصول - نہ کوئی غیر متبدل ضابطہ حیات - ہماری نئی نسل کے نوجوانوں کو پوری پوری آزادی ہوگی کہ وہ جس طرح سوچنا چاہیں سوچیں اور جو راستہ اپنے لئے جی چاہے اختیار کریں - مستقل، جامد اور ناقابل تغیر اصولوں کی تعلیم دینا، اور انکی پابندی کرانا، ان نوجوانوں کی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہے - ہمیں ایسا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں -

ظاہر ہے اخلاقی یا روحانی مستقل اقدار کا ذکر چھیڑنا تو ان صاحب کے نزدیک قدامت پرستی کی دلیل ہوگا اس لئے میں ان کا تذکرہ تو نہیں کرنا چاہتا لیکن ایک معلم ہونے کی حیثیت سے دو ایک سوال انکے پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں ضرور پوچھنا چاہونگا - میں ان سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ (مثلاً) ریاضی کے استاد ہیں تو وہ (مثلاً) جیومیٹری کی BASIC PROPOSITIONS کے متعلق اپنے شاگردوں کو کیا پڑھاتے ہیں کہ وہ ناقابل تغیر ہیں یا طلبا کو اس کی آزادی ہے کہ وہ انہیں جس طرح جی چاہے مانیں - مثلاً یہ کلیہ کہ ایک مثلث کے دو اضلاع کا مجموعہ تیسرے ضلع سے ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے - ایک ناقابل تغیر اصول ہے، یا اس میں طلبا اپنی مرضی کے مطابق تغیر و تبدل کر سکتے ہیں — یا مثلاً اگر وہ سائنس کے پروفیسر

ہیں تو ان کے نزدیک طبیعیات کے بنیادی قوانین: THE LAW OF CAUSE & EFFECT اور THE LAW OF UNIFORMITY OF NATURE غیر متبدل ہیں یا قابلِ تغیر و تبدل! کیا وہ اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم جی چاہے تو ان اصولوں کو مانو اور جی چاہے تو ان سے انحراف برتو۔ ہم تمہاری آزادی کے راستے میں مزاحم نہیں ہونا چاہتے۔

میرا خیال ہے کہ یہ بزرگوار ان مضامین میں تو طلبا کو بھی اس کا اختیار نہیں دیتے ہونگے کہ وہ ان کے بنیادی مسلمات کو جس طرح جی چاہے مانیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں دوسرے ہی دن ملازمت سے جواب مل جائے لیکن اخلاق و اقدار کی دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں یہی تعلیم دینی چاہیئے کہ نوجوانوں کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ بلاحدود و قیود، جو جی میں آئے معاشرہ میں کریں — یہ ہے وہ تعلیم جو ہماری درسگاہوں میں ہمارے نوجوان طالب علموں کو دی جا رہی ہے اور اس کے بعد قوم کمیشن بٹھاتی ہے یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ "ناکس بے راہی نوجوانوں کے ہاتھوں جس درندگی کا مظاہرہ ہوا، اس کے اسباب و علل کیا تھے"!

میں نے یہ بات ٹیلی ویژن کے پروگرام سے چھیڑی تھی اس لئے میں اپنے سامعین گرامی قدر کو پھر وہیں لے جانا مناسب سمجھتا ہوں۔

وہ شرکائے مباحثہ، ٹیلی ویژن کا پروگرام ختم کر کے چلے گئے لیکن میرے لئے گہری سوچ کا سامان چھوڑ گئے — میں نے سوچا کہ ہماری قوم کی کس قدر بدقسمتی اور ہمارے ان نوجوانوں کی کس قدر حرماں نصیبی ہے کہ ہمارے ہاں ایک ایسا لٹریچر موجود ہے جو ان کے اس قسم کے سوالات کا نہایت معقول اور اطمینان بخش جواب دے سکتا ہے لیکن انہیں ایک خاص سازش کے تحت اس کی فکر سے دور در رکھا جا رہا ہے۔ اس لٹریچر نے اپنی اس فکر کو اپنے ذہن کے خزانے ہی میں مدفون نہیں کر رکھا بلکہ اپنی تصانیف کے ہزاروں صفحات پر بکھیر کر عام کر دیا ہے لیکن مفاد پرست گروہوں کے جھوٹے پراپیگنڈہ نے خود ان کتابوں کو ایسا (WET PAINT) بنا دیا ہے کہ کوئی ان کے قریب جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں علی وجہ البصیرت اور ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان میں سے دو چار کتابوں کو بھی ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بطور نصاب داخل کر دیا جاتا تو آپ دیکھئے کہ ہمارے ان نوجوانوں کے قلب و دماغ میں کس قدر خوشگوار انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

مثلاً اس ایک سوال کے سلسلہ میں جو مذکورہ صدر بحث کا موضوع تھا، اس علم نے آج سے پچیس تیس سال پہلے جو قرآنی تعلیم پیش کی ہے اگر ان طلبا کو اس سے متعارف کرا دیا جاتا تو انہیں اس قسم کے سوالات پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اس معلم نے ہمیں بتایا کہ:۔

(۱) انسان سے نیچے مخلوق کی صورت میں فطرت نے یہ پروگرام رکھا ہے کہ جس مقصد کے لئے کسی شے کو پیدا کیا گیا ہے اور جو کچھ اس کے لئے مفید اور مضر ہے، ان سب کا علم اس شے کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اسے اس شے کی فطرت کہا جاتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے۔ فطرت کہتے ہیں اس داخلی رجحان کو جس کے مطابق چلنے کے لئے وہ شے مجبور ہو۔ لہٰذا کائنات کی ہر شے اپنی اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اور ان کی فطرت بھی غیر متبدل ہے۔

(۲) خدا نے انسان کو چونکہ اختیار و ارادہ اور انتخاب کی صلاحیتوں سے نوازا ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں۔

فطرت ہوتی ہی مجبور کی ہے۔ فطرتِ انسان یا (HUMAN NATURE) کا تصور غیر قرآنی اور خلافِ علم و حقیقت ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں جس کے مطابق چلنے کے لئے اسے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔

(۳) جسے انسانی ضمیر کہا جاتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس قسم کے ماحول میں انسانی بچہ پرورش پاتا ہے اسکے نقوش اس کے غیر شعوری نفس پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جس قسم کا ماحول ہو اسی قسم کی اس فرد کی ضمیر۔ جینی بچہ کی ضمیر گوشت سے ابا کرتی ہے مسلمان گھرانے کا بچہ اس کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ ضمیر درحقیقت (SOCIETY INTERNALISED) ہے۔ اسے جب جی چاہے مناسب تعلیم و تربیت سے بدلا جا سکتا ہے۔

(۴) باقی رہی عقل، سو اگر اسے بیباک چھوڑ دیا جائے تو وہ انسانی جذبات کے مقاصد کے حصول کے اسباب و وسائل مہیا کرنے کا آلہ اور اس کے فیصلوں کو (JUSTIFY) کرنے کے لئے دلائل فراہم کرنے کا ذریعہ ہے یعنی وہ ایک صلاحیت ہے جسے ہر فرد اپنی مصلحت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق و باطل اور خیر و شر کا معیار بن سکے۔ اس کے لئے اسے خارجی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس راہ نمائی کو وحیِ خداوندی کہا جاتا ہے جو رسولوں کی معرفت انسانوں تک پہنچی تھی ــــ لہٰذا ' اچھے اور بُرے اخلاق کا معیار وحیِ خداوندی ہے' جو عالمگیر بھی ہے ' اور غیر متبدل بھی ـــ

انسانی زندگی کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ یہ اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھے اور عقل سے وحی کی راہنمائی میں کام لے۔ وحی اور عقل کا وہی رشتہ ہے جو انسانی آنکھ اور سورج کی روشنی کا ہے۔

اس باب میں انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا گیا ــ وحی کی راہ نمائی اس کے سامنے ہے اور اسے اسکے اختیار و ارادہ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اسکے مطابق چلے اور چاہے اس سے انحراف برتے۔ جس قسم کا راستہ یہ اختیار کریگا اس کے مطابق نتائج اس کے سامنے آجائینگے ــــ وحی کی یہ راہ نمائی اب اپنی آخری، مکمل اور غیر متبدل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ ہے' اور چونکہ یہ مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہے' اسلئے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں ــــ

جو شخص وحی کی اس راہ نمائی پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہے اور بطیبِ خاطر اسے اپنی زندگی کا ضابطہ قرار دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے' وہ اس سوسائٹی کا رکن بن جاتا ہے جسے امتِ مسلمہ یا ملتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ سوسائٹی ایک ایسا معاشرہ قائم کرتی ہے جو وحی کی غیر متبدل اقدار کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو افراد اپنے دل و دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ اس سوسائٹی کے رکن بنیں انہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس سوسائٹی کے ارکان رہتے ہوئے' جی چاہے تو اِن اقدار کا اتباع کریں اور جی چاہے تو اِن سے انحراف برتیں ــ اگر وہ اس سوسائٹی کے ممبر رہنا نہیں چاہتے تو انہیں اس کی پوری پوری آزادی ہوگی کہ وہ جب جی چاہے اس سے الگ ہو جائیں لیکن انہیں اس کی آزادی نہیں دی جا سکے گی کہ وہ اس سوسائٹی کے ممبر بھی رہیں اور اسکے اصولوں سے سرکشی بھی برتیں۔

یہ ہے وہ تعلیم جو ہمیں اس معلم نے دی۔ میں نے جو کچھ ابھی کہا ہے وہ ان کی ایک کتاب "سلیم کے نام خطوط" کے ایک خط میں موجود ہے۔ اگر وہ طالب علم جنہوں نے ٹیلیویژن کے اِس پروگرام میں حصہ لیا تھا میرے سامنے ہوتے تو میں انکے سامنے یہ تعلیم پیش کر کے ان سے پوچھتا کہ کیا اسکے بعد انہیں کچھ اور پوچھنے کی ضرورت رہ جاتی ہے ــ!

یہ عجیب بات ہے کہ اس بات کا احساس شعبہ تعلیم سے متعلق اربابِ نظم و نسق تو نہ کر سکے لیکن ایک اور بالغ نظر

کی نگاہ اس تک پہنچ گئی۔ یہ بالغ نظر تھے مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس محترم کیانی (مرحوم)۔ انہوں نے ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج لائلپور کے کانووکیشن ایڈریس میں فرمایا تھا۔

> اس سلسلہ میں وہ تجویز قابلِ توجہ ہے جسے طلوعِ اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہماری درسگاہوں میں اسلامیات سے متعلق تعلیم کو اسلامی تاریخ اور دینیات کے مسائل تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس کے دائرے کو وسیع کیا جائے اور طالب علموں کو بتایا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کی نشوونما کے اصول کیا ہیں۔ وہ کونسی خصوصیات ہیں جو ان کو حیوان سے تمیز کرتی ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کس طرح ہماری زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ مختصراً انہیں ان مستقل اقدار کی تعلیم دیجائے جو قرآن کریم میں منضبط و محفوظ ہیں۔ (پاکستان ٹائمز - ۵/۶/۶۱)
>
> (طلوعِ اسلام بابت مئی جون ۱۹۶۱ء۔ صفحہ ۱۴۲)

یہ معلم دنیا میں پرویز کے نام سے متعارف ہے اور ہم اسے ان کی شفقت اور جذبۂ احترام کی بنا پر باباجی کہہ کر پکارتے ہیں۔ باباجی کی یہ کتابیں ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہ ہو سکیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی اور ہمارے نوجوان طبقہ کی حرماں نصیبی ہے لیکن جن اربابِ ہمت نے اب اس درسگاہ کے قیام کا بیڑہ اٹھایا ہے جس میں باباجی کی کتابیں نہیں، باباجی بذاتِ خود قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کرینگے، مستحق صد مبارکباد ہیں۔ خدا انکے اس ارادے کو جلد از جلد شرمندۂ تکمیل عطا فرمائے۔

کس قدر خوش بخت ہونگے وہ بچے جو اس قسم کے مفکر و معلم کے زیرِ تربیت تعلیم حاصل کرینگے۔ یقین مانیئے جب میں ان کی خوش بختی کا تصور کرتا ہوں تو بے ساختہ دل میں یہ آرزو ابھرتی ہے کہ اے کاش! میں پروفیسر ہونے کے بجائے ان خوش نصیب بچوں کی صف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کر سکتا! اور یوں تو ہمیں یہ سعادت اب بھی حاصل ہے جس پر ہم جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔

بقیہ:- "خطابات کے پمفلٹ" سلسلے از صہ ۴۳

۲- پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ قرآنِ کریم نے قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین بیان کرنے کے بعد ان کی صداقت کے ثبوت میں اممِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کی ہیں۔ اس خطاب میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے ان اٹل قوانین اور اممِ گزشتہ کے احوال و ظروف کی روشنی میں پاکستان کے متعلق قاضیٔ ازل کا فیصلہ کیا ہے۔ سائز کاغذ، حجم پہلے پمفلٹ جیسا۔ اور قیمت بھی وہی ۷۵ پیسے (محصولڈاک دس پیسے)

۳- اسلامی سوشلزم مارکسزم کا فلسفہ، سوشلزم کی حقیقت، کمیونزم کا ناقابلِ عمل معاشی نظام۔ اسلامی سوشلزم کا ابہام۔ قرآن کا معاشی نظام — اس خطاب نے ملک میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ صدر بھٹو کے حالیہ وضاحتی بیان کو اس خطاب کی روشنی میں پڑھنے سے بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ طلوعِ اسلام سائز۔ سفید کاغذ ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ (محصولڈاک دس پیسے)

دس یا دس سے زیادہ پمفلٹ منگانے پر محصولڈاک ہم خود برداشت کرینگے لیکن پیکٹ عام ڈاک سے بھیجا جائے گا۔
اگر آپ بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیں تو اس کے لئے ساٹھ پیسے فی پارسل الگ بھیجئے۔ (ناظم)

کتابوں کی قیمتوں میں تھوڑا سا اضافہ

ہم نے ادارہ کیطرف سے شائع کردہ کتابوں کی قیمتیں اس زمانے میں مقرر کی تھیں جب چیزیں سستی تھیں۔ اس کے بعد گرانی ہوتی گئی لیکن ہم نے کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ نہ کیا۔ لیکن اب صورت حالات ہماری برداشت سے باہر ہوگئی ہے جس کی وجہ سے ذیل کی کتابوں کی قیمتوں میں تھوڑا سا اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں:-

(۱) لغات القرآن۔ جلد چہارم (-/۱۲ روپے کی بجائے -/۱۵ روپے) مکمل سیٹ چار جلد -/۶۰ روپے

(۲) انسان نے کیا سوچا؟ (اعلیٰ مجلد) -/۱۲ روپے کی جگہ -/۱۵ روپے

(۳) سلیم کے نام خطوط۔ جلد اول (-/۸ روپے کے بجائے -/۱۰ روپے)۔ دوسری اور تیسری جلد (-/۶ روپے فی جلد کے بجائے -/۸ روپے فی جلد) مکمل سیٹ -/۲۶ روپے

(۴) اسلام کیا ہے؟ - اعلیٰ ایڈیشن (-/۸ روپے کے بجائے -/۱۰ روپے)۔ سستا ایڈیشن (-/۴ روپے کے بجائے -/۶ روپے)

(۵) جہانِ فردا۔ سستا ایڈیشن (-/۶ روپے کے بجائے -/۸ روپے)۔ اعلیٰ ایڈیشن (وہی دس روپے)

(۶) قرآنی فیصلے۔ جلد اول (نیا ایڈیشن زیر طباعت)۔ قیمت ہر سہ جلد پانچ پانچ روپے۔

(۷) قرآنی قوانین (مجلد)۔ تین روپے کے بجائے چار روپے ● غلام اور لونڈیاں۔ (ڈیڑھ کی بجائے دو روپے)

(۸) فردوسِ گم گشتہ۔ (مجلد) آٹھ روپے کے بجائے دس روپے ● (۹) سلسبیل (مجلد)۔ آٹھ روپے کے بجائے دس روپے۔

(۱۰) مقامِ حدیث۔ اردو ایڈیشن (-/۴ روپے کے بجائے -/۵ روپے) ● (۱۱) الفتنۃ الکبریٰ (مجلد) چھ روپے کے بجائے آٹھ روپے۔

(۱۲) تاریخ الامت۔ آٹھ جلدیں۔ قیمت ہر جلد (بجز جلد پنجم) تین روپے۔ جلد پنجم۔ چار روپے۔ مکمل سیٹ پچیس روپے۔

(۱۳) ISLAM: A CHALLENGETO RELIGION۔ سستا ایڈیشن (-/۱۶ روپے کی جگہ -/۲۰ روپے)۔ اعلیٰ ایڈیشن (وہی -/۲۵ روپے)

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

پرویز صاحب کے تازہ ترین، انقلاب آفریں

خطابات کے پمفلٹ

طلوع اسلام کی سابقہ کنونشن میں پرویز صاحب نے تین خطابات ارشاد فرمائے جنہوں نے ملک کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ جن مسائل کے متعلق ان میں بحث کی گئی ہے ان کا تعلق پاکستان کی بنیادی زندگی سے ہے اس لئے ان کا ہر جگہ چرچا ہو رہا ہے۔ ان خطابات کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے تاکہ انکی اشاعت عام ہو سکے۔

(۱) **چراغ اور تو** اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ پاکستان گزشتہ پچیس سال میں کن صبر آزما مراحل سے گزرا اور اب کس طرح تباہی کے جہنم کے کنارے کھڑا ہے اور اس تباہی سے بچنے کی صورت کیا ہے۔ بڑا عبرت آموز اور حقیقت کشا پمفلٹ ہے۔ طلوع اسلام کا سائز، سفید کاغذ، حجم ۳۲ صفحات۔ قیمت فی پمفلٹ ۷۵ پیسے۔ (محصول ڈاک دس پیسے)

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

رابطۂ باہمی

اجتماعِ لائل پور

طلوعِ اسلام کنونشن میں مختلف بزموں نے مفکرِ قرآن کو اپنے ہاں بلانے کی دعوت دی۔ ان میں سرِفہرست بھی بزم لائلپور کا نام تھا اور انہی نے اس سلسلہ میں سبقت بھی کی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۲ مئی کی شب لائلپور میں ایک جلسۂ عام کے انعقاد کا انتظام کیا۔ مفکرِ قرآن اپنے رفقاء کے ساتھ قبل از دوپہر وہاں تشریف لے گئے اور محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب کے دولتکدہ پر قیام پذیر ہوئے۔ بعد میں آنے والے احباب راقم الحروف کے ہاں فروکش ہوئے۔ جلسہ کا انتظام اقبال پارک (عرف دھوبی گھاٹ) کے وسیع و عریض میدان میں کیا گیا تھا جہاں دو ہزار کے قریب کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ روشنی کے حسنِ انتظام سے سارا میدان بقعۂ نور بن رہا تھا اور لاؤڈ سپیکروں کی صاف و نکھری ہوئی آواز نشیدِ قرآنی کو دور دور تک پہنچا رہی تھی۔ مفکرِ قرآن ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں پہنچے تو خاکساروں کے ایک دستہ نے انہیں سلامی دی۔ جلسہ کی کارروائی حافظ محمد یونس صاحب کی تلاوت سے شروع ہوئی جبکہ محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب زینتِ دہِ مسندِ صدارت تھے۔ اس کے بعد ناظم ادارہ طلوعِ اسلام محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے پیامِ اقبالؒ سے محفل کو گرمایا۔ اور راقم الحروف نے مختصر الفاظ میں تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف کرایا۔ پرویز صاحب خطاب کے لئے اٹھے تو سامعین نے نہایت گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ یہ تقریب بیادِ اقبالؒ منائی گئی تھی اور اسی نسبت سے خطاب کا عنوان تھا — اقبالؒ اور نظریۂ پاکستان — اقبالؒ کا پیام اور مفکرِ قرآن کی زبان۔ غالب کے الفاظ میں یوں کہئے کہ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

سامعین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اس دو گھنٹے سے بھی زائد خطاب کے دوران کیا مجال جو کسی کے اونچے کھانسنے کی آواز بھی سنائی دی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سامعین میں سے ہر ایک دوسرے سے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ رہا تھا کہ

مژہ برہم مزن، تا نشکنی رنگِ تماشا را

پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں دو قومی نظریہ، نظریۂ پاکستان، اسلامی حکومت کے امتیازی خط و خال، استبداد و ملوکیت کی آتش افشانیوں، جمہوری نظام کی ابلہ فریبیوں، نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیوں، مارکسزم کی زہر افشانیوں اور قرآنی نظام کی انسانیت ساز فردوس آفرینیوں کے مناظر ایسے حسین اور دلکش انداز میں کھینچے کہ ان کے ایک ایک فقرہ پر یوں نظر آتا تھا جیسے ستور حقیقتوں پر سے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہوں۔ ساڑھے دس بجے کے قریب یہ حقائق و معارف کی شگفتہ و شاداب محفل ختم ہوئی تو سامعین میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا کہ لائلپور میں اس قسم کی بصیرت افروز و جاذب فضا اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

ہفتہ کی صبح ڈاکٹر صاحب کے مکان پر لائلپور کے اربابِ دانش و بینش از خود جمع ہو گئے جن میں طالب علموں کی کثرت تھی۔ اس نجی محفل میں مختلف ملی مسائل زیرِ بحث آئے جنہیں پرویز صاحب نے اپنے مخصوص بلیغ اور دلکش انداز میں اختصار اور جامعیت سے سلجھایا۔ دس بجے کے قریب احباب نے اپنے محبوب مفکر کو یہ کہہ کر بادلِ ناخواستہ رخصت کیا کہ:

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

(نذیر طارق۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور)